رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ جلد ۳۶ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

فہرستِ مضامین

جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۳۶۳ھ، مئی، جون ۱۹۴۴ء، جلد ۲۴۔ عدد ۵، ۶

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ۔ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

دار الاسلام، متصل پٹھان کوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ماہ جمادی الاولیٰ وجمادی الاخریٰ کا یہ یکجائی پرچہ ناگزیر اسباب کی وجہ سے بڑی تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے لیے حکومت کی طرف سے "اخباری کاغذ" کا جو حصہ مقرر تھا وہ ہماری اصل ضروریات سے بہت کم تھا۔ اس کمی کو ہم دوسرے کاغذ کے ذریعہ سے بمشکل پورا کرکے ۴۸ صفحہ ماہوار کا پرچہ نکال رہے تھے۔ لیکن یکایک حکومت کا یہ "فرمان" جاری ہوا کہ جو پرچے اخباری کاغذ لیتے ہیں وہ دوسری قسم کا کاغذ بلا اجازت استعمال نہیں کر سکتے۔ مجبوراً ہم نے پرچے کی اشاعت روک کر اجازت کی درخواست کی۔ لیکن اس کا جواب نفی میں ملا۔ اس کے بعد پھر ایک "فرمان" جاری ہوا کہ اخبارات ورسائل اور ناشرین کتب اپنے کاغذ کے خرچ میں ۳۹ء اور ۴۲ء کے اوسط سے ۷۰ فی صدی کمی کر دیں۔ یہ حکم ہندوستان کے پورے اشاعتی کام کے لیے پروانۂ موت کا حکم رکھتا ہے۔ اب ہم نے درخواست کی ہے کہ کم از کم اس پرچے کو جو تیار ہے اور پریس میں جا چکا ہے، شائع کرنے کی اجازت دی جائے۔ اگر اجازت آگئی تو یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ ورنہ شاید اس کا بھی خشدکرنا پڑے گا۔ آئندہ کے لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ترجمان القرآن کس شکل میں شائع ہوتا ہے۔ حکومت کے تازہ احکام سے اگر ہمیں مستثنیٰ نہ کیا گیا (جس کی امید کم ہی ہے)، تو شاید اس پرچہ کی ضخامت ۲۴ صفحہ سے زیادہ نہ رہ سکے گی۔ فصبر جمیل واللہ المستعان۔

حکومت کے ان تازہ احکام نے ہمارے دارالاشاعت کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی ہے۔ اب تک کاغذ کی کمیابی کے باوجود کسی نہ کسی طرح مشکلات کا مقابلہ کرکے ہم کتابیں شائع کیے جا رہے تھے، اگرچہ ہماری بیشتر کتابیں خارج از ذخیرہ رہتی تھیں۔ لیکن اب کاغذ کے خرچ میں ۷۰ فی صدی کمی کا قطعی حکم جاری ہو گیا ہے،

جس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے جو تھوڑی بہت کتابیں شائع ہو رہی تھیں ان کا بھی صرف ایک تہائی حصہ شائع ہو سکے گا۔ اس مصیبت کا کوئی حل ہمیں نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ اللہ ہماری مدد فرمائے اور شیطان کے شکنجہ کو اگر توڑتا نہیں تو کم از کم اتنا ڈھیلا ہی کر دے کہ ہم ذرہ جنبش تو کر سکیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے حکمرانوں پر جنگ کا جنون روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ طاری ہوتا جا رہا ہے، حتٰی کہ انھیں اب اپنی جنگی اغراض کے مقابلہ میں اپنے افعال کے اخلاقی پہلو کی سرے سے کوئی پروا ہی نہیں رہی ہے۔ وہ اِس ملک کے تمام ذرائع و وسائل کو جنگ کی آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں، خواہ باشندگان ملک پر کچھ گذر جائے۔ بنگال کے قحط کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گذرے ہیں۔ وہ قدرت کی طرف سے کسی دست کشی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ سراسر انہی لوگوں کے جنون جنگ کا نتیجہ تھا۔ اگر ملک کے نظام حکومت کی باگیں کسی ایسے گروہ کے ہاتھ میں ہوتیں جس کے اندر اپنی اخلاقی ذمہ داری کا کچھ بھی احساس ہوتا تو اُس کے ڈوب مرنے کے لیے یہ بات بالکل کافی تھی کہ لاکھوں بے گناہ انسان اس کی کسی غلط پالیسی کی بدولت بھوک سے تڑپ تڑپ کر جان دیدیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ ہمارے حکمرانوں کی اکڑ میں اس سے ذرا فرق نہ آیا، اور اسی سے ہم کو اندازہ ہو گیا کہ اب ہمیں جن سے سابقہ درپیش ہے اُن سے کوئی ایسی توقع وابستہ نہیں کی جاسکتی جو انسانوں سے وابستہ کی جاتی ہے۔ اسی کیفیت کا ظہور اب ایک دوسری شان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ پہلے جس خود غرضانہ سنگدلی اور سنگدلانہ بے حسی کا معاملہ ہماری جسمانی زندگی کے ساتھ برتا گیا تھا۔ اب وہی معاملہ ہماری علمی زندگی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ باہر سے کاغذ کی درآمد بند ہو جانے کے بعد ہندوستان کی تمام کاغذی ضروریات کا انحصار صرف اُس کاغذ پر رہ گیا تھا جو اسی ملک کے کارخانوں میں تیار ہوتا ہے، اور وہ ملک کی اصل ضرورت کا بمشکل ۵۰ فی صدی حصہ پورا کر سکتا تھا۔ مگر اس پیداوار میں سے ان لوگوں نے اغراض حکومت کے لیے بہت بڑا حصہ مخصوص کر لیا اور بہت ہی قلیل حصہ اہل ملک کے لیے چھوڑا۔ پھر جب اپنی حضرات کی جنگی پالیسی کی بدولت

ملک کی کاغذی پیدا وار بڑھنے کے بجائے اُلٹی تیس چالیس فی صدی کم ہو گئی، تو اب یہ اہل ملک سے مطالبہ فرما رہے ہیں کہ اپنے کاغذ کے خرچ کو، جو پہلے ہی بہت کچھ گھٹ چکا تھا، ۷۰ فی صدی اور گھٹا دیں تا کہ اُس فضول لٹریچر کی اشاعت میں کمی کے بجائے کچھ مزید اضافہ ہو سکے جو جنگی پروپیگنڈا کے سلسلہ میں ہر طرف پھینکا جا رہا ہے اور جس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت بجز منفی قدر و قیمت کے نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اِس گروہ کو اپنی سرکاری اغراض کی خاطر ایک پورے ملک کے علوم و فنون و آداب پر سکوتِ موت طاری کر دینے میں ذرہ برابر تامل نہیں ہے اور یہ بظاہر مہذب کارفرمایانِ حکومت بغیر کسی شرم کے علی الاعلان ایسے فرامین جاری کر سکتے ہیں جن کا خیال بھی اگر کسی مہذب آدمی کے دماغ میں آئے تو وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگے۔

پھر لطف یہ ہے کہ ان فرامین کے اجراء و نفاذ میں بالکل ایک مشین کی سی بے عقلی سے کام لیا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کاروبار کو چلا رہے ہیں انھیں علوم و آداب سے آشنائی کا کبھی اتفاق نہیں ہوا اسی لیے ان کی سادہ بینائی میں تمام مطبوعہ کاغذ ایک ہی درجہ و مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُس لٹریچر میں جو اپنی کوئی علمی و اخلاقی یا تمدنی قدر و قیمت نہیں رکھتا اور اُس لٹریچر میں جو درحقیقت کوئی قدر و قیمت رکھتا ہے، کسی قسم کا فرق نہیں کرتے، بلکہ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ جس جہالت کا ثبوت بازار کا وہ کباڑیا دیتا ہے جو بہترین علمی کتابوں کو ناولوں اور افسانوں کے ساتھ ملا کر ایک ہی بھاؤ بیچ ڈالتا ہے، ٹھیک اسی جہالت کا ثبوت یہ لوگ دے رہے ہیں جو یورپ اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں برسوں تعلیم پانے کے باوجود محض ایک غیر انسانی حکومت کی مشینری میں نصب ہو جانے کی وجہ سے ذوق و تمیز کے ابتدائی احساسات تک کھو بیٹھے ہیں۔ انھوں نے آج تک اس امر کی کوئی کوشش نہیں کی، اور نہ ایسی کسی کوشش کے آثار نظر آتے ہیں کہ کاغذ کے اس مصنوعی قحط کی ہلاکت آفرینیوں سے حقیقی فائدہ بخش لٹریچر کو حتی الامکان بچائیں اور اپنا کلھاڑا ــــ اگر اسے چلانا ہی ہے تو ــــ اس گندے اور مخش اور

فضول لٹریچر پر چلا رہیں جو ملک کے اخلاق کو غارت اور مال کو ضائع کر رہا ہے۔

ان تمام کارروائیوں کو جائز ثابت کرنے کے لیے موجودہ جنگ کو ہماری قومی جنگ قرار دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں یہ جنگ حقیقت میں قومی جنگ ہے وہاں بھی یہ صورت حال نہیں ہے۔ اگرچہ ان سب قوموں نے اپنا سب کچھ لا کر اس کشمکش موت وحیات میں جھونک دیا ہے، مگر ان میں سے کسی نے بھی اپنی علمی زندگی پر حتی الامکان کوئی آنچ نہیں آنے دی ہے۔ سوویٹ روس سے بڑھ کر اس جنگ میں غالباً کسی ملک پر تباہی نہیں آئی ہے، مگر دنیا کو معلوم ہے کہ اس عام قومی تباہی کی حالت میں بھی وہاں علوم و آداب کی اشاعت بدستور پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ تقریباً یہی حال جرمنی و انگلستان کا ہے کہ دونوں ملک اپنی قومی زندگی کا فیصلہ تلوار کے حوالے کر کے دیوانہ وار لڑ رہے ہیں لیکن اس دیوانگی میں بھی انھیں اتنا ہوش ہے کہ مفید لٹریچر کی اشاعت میں انھوں نے کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہونے دی ہے۔ پس جنگ اور اس کی ضروریات کا عذر فی الواقع محض ایک عذر لنگ ہے۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک قوم پر دوسری قوم کا خود غرضانہ تسلط، خواہ کتنے ہی پُرفریب اخلاقی نقاب اوڑھے، مگر ہر آزمائش کے موقع پر اپنا گھناؤنا چہرہ دکھا کر ہی رہتا ہے۔

ہم نے اس جنگ کے دوران میں اپنے حکمرانوں کو براہِ راست کبھی مخاطب نہیں کیا ہے، کیونکہ وہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو اخلاقی حیثیت سے سرخرو بنا کر پیش کرنے کے لیے باشندگان ملک کو راست گوئی سے باز رکھنے کی بہت سی تدبیریں "قانون" کے نام سے اختیار کیے بیٹھے ہیں، اور ہم وقتی معاملات کی خاطر اپنے اُس کام کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے جو مستقبل کے تعمیری و اصلاحی انقلاب کے لیے ہم کر رہے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ان کے بہت سے اخلاقی جرائم پچھلے چار پانچ سال میں دیکھے اور دل پر جبر کر کے سکوت اختیار کیا۔ لیکن اب کہ سرے سے وہ کام ہی تمام ہوتا نظر آ رہا ہے جس

کی خاطر یہ سارا سکوت تھا۔ ہم ان لوگوں سے کسی جذبۂ نفرت و غضب کے بغیر خالص جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنگ اور اس کی ضروریات کتنی ہی شدید سہی، مگر براہِ کرم اپنے حواس بیدار رکھو۔ تم وقتی فائدہ و نقصان کی فکر میں اتنے کھوئے جا رہے ہو کہ اپنی حرکات کے دوررس اخلاقی نتائج سے تم نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ تم بھول گئے ہو کہ زندگی کی کشمکش میں اخلاقی شکست کھا جانے کے بعد کوئی فوجی فتح تم کو عزت کے مقام پر برقرار نہیں رکھ سکتی اور نہ مجرد مادی طاقت کے بل پر تم زیادہ مدت تک دنیا میں برسرِ اقتدار رہ سکتے ہو۔ تمھیں یہ بھی یاد نہیں رہا ہے کہ زمانہ ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے اور وہ شخص سخت نادان ہے جو آج کی مصلحت بینیوں میں گُم ہو کر کل کی مصلحت کو فراموش کر دے۔ وقت خواہ کتنا ہی برا ہو، بہرحال گذر جاتا ہے، مگر اپنی ایک مستقل یادگار تاریخ میں چھوڑ جاتا ہے اور اس کے برے اثرات نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔ تم نے اگر اس وقت کو ظلم و زیادتی کے ساتھ گذارا تو یہ ہم پر سے بھی بہرحال گذرے گا اور تم پر سے بھی، مگر اس طرح کہ تم اپنی آئندہ نسلوں کے لیے تاریخ میں ایک ایسی شرمناک میراث چھوڑ جاؤ گے جس پر وہ صدیوں تک دنیا میں نظر اونچی نہ کر سکے گی۔ امریکہ میں تمھارے اسلاف نے تمھارے لیے ایسی ہی میراث چھوڑی تھی جس کا نتیجہ آج یہ دیکھ رہے ہو کہ ہر امریکن کے سامنے تمھاری نگاہ نیچی ہے۔ آئرلینڈ میں تم نے ایسی ہی میراث چھوڑی، اور آج تم کو تجربہ ہو گیا کہ تمھارے قریب ترین ہمسایہ نے تمھارے اخلاق کا کیا اثر لیا ہے۔ اب کیا تم ہندوستان میں بھی ایسی ہی میراث چھوڑنا چاہتے ہو؟ تمھارے اصل کارنامے وہ نہیں ہیں جو تم آپ ہی اپنی مدح میں بیان کر لیا کرتے ہو، بلکہ وہ ہیں جو تاریخ میں باقی رہ جائیں۔ اور تاریخ میں بیسیوں قوموں کی تصویریں تم دیکھ چکے ہو۔ پھر کیا تم نے عزم کر لیا ہے کہ اپنی تصویر کے لیے بھی اسی گیلری میں کوئی بلند جگہ محفوظ کراؤ گے؟

ہمارے رفقاء کو متنبہ ہو جانا چاہیے کہ اب اس پیغام کی اشاعت اس محدود پیمانہ پر بھی شاید جاری نہ رہ سکے گی جس پر پچھلے دو سال میں جاری رہی ہے۔ اس لیے ان کی ذمہ داریاں پہلے سے اب کئی گنی زیادہ ہو جائیں گی۔ مرکز سے اشاعت کا کام فی الجملہ جو جاری ہے تو آپ محض لٹریچر کو بندگانِ خدا تک پہنچا کر بھی ایک حد تک اپنے فرضِ تبلیغ و دعوت سے سبکدوش ہو سکتے ہیں، لیکن جب اس اشاعت کا کام شیطانی مزاحمتوں سے رُک جائے یا برائے نام ہی باقی رہ جائے تو دعوت و تبلیغ کا

سارا بوجھ آپ ہی حضرات پر آپڑے گا۔ اب آپ میں سے ایک ایک شخص کو چلتے پھرتے لٹریچر کی حیثیت سے کام کرنا پڑے گا۔ سستی چھوڑ دیجیے اور سعی میں سرگرم ہو جائیے۔ عام مجمعوں میں لٹریچر سنائیے، اپنے حلقۂ ملاقات میں زبان سے دعوت کو پہنچائیے، شیخ احمد سرہندیؒ کی طرح خطوط سے دوستوں اور عزیزوں میں ان خیالات کو پھیلائیے، اور اس احساس کے ساتھ کام کیجیے کہ آپ کو اپنے رب کے سامنے اپنے ادائے فرض کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ یہ فساد جو خلق خدا میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے، اس کی ذمہ داری میں شریک نہ ہونا اور اپنی حد امکان تک اصلاح کی سعی کرنا یہی دو چیزیں ہیں جو آپ کے انجام کو مجرمین کے انجام سے الگ کر سکیں گی، ورنہ بعید نہیں کہ آپ اپنی نمازوں اور اپنے روزوں کے باوجود اسی ٹھکانے پر پہنچ جائیں جس کی طرف یہ قافلہ گرم رفتار جا رہا ہے۔

دعوت و اصلاح کے سلسلہ میں ایک اہم بات جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ وسیع پیمانہ پر منتشر و متفرق تبلیغ اگرچہ مسئولیت سے سبکدوش ہونے کے لیے کافی ہو سکتی ہے لیکن یہ حکیمانہ تبلیغ نہیں ہے اور کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جو ہمیں مطلوب ہیں۔ اس کے بجائے محدود پیمانہ پر مستقل اور مسلسل تبلیغ زیادہ حکیمانہ، زیادہ مفید اور زیادہ نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ تبلیغ دراصل ایک قسم کی تخم ریزی ہے۔ تخم ریزی کی ایک صورت وہ ہے جو ہواؤں اور جانوروں کے ذریعہ سے انجام پاتی ہے جس سے ہر طرح کے بیج ہر طرف زمین پر پھیل جاتے ہیں اور منتشر طور پر ہر قسم کے درخت اگ آتے ہیں۔ ایسی تخم ریزی کی پیداوار میں کوئی نظم نہیں ہوتا اور نہ کوئی باقاعدہ فصل کاٹی جا سکتی ہے۔ دوسری قسم کی تخم ریزی وہ ہے جو ایک کسان کرتا ہے۔ وہ ایک ہی زمین پر مسلسل محنت کر کے اسے تیار کرتا ہے، پھر ایک منصوبہ کے مطابق اس میں بیج ڈالتا ہے، پھر پیہم اس کو پانی دیتا اور اس کی خبر گیری کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ویسی ہی فصل تیار ہو جاتی ہے جیسی اس کو مطلوب ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے رفقا اپنی تخم ریزی میں ہواؤں اور پرندوں کا سا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ کسان کا سا طریقہ اختیار کریں۔ ہر شخص اپنے قریب ترین ماحول میں سے ایک ایک حلقہ کو منتخب کرے گویا باقاعدہ اپنے چارج میں لے لے اور اس کے اندر مسلسل کام کرے۔ پہلے وہ اساسی عقائد اور بنیادی اصول اخلاق پیش کرے جن سے زمین تیار ہو۔ پھر بتدریج دین و اخلاق کے اصول و کلیات سے فروع اور تفصیلات کی طرف بڑھے اور پیہم اپنی تلقین اور اپنے عملی برتاؤ اور اپنی ہدایت و نگرانی سے اس امر کی کوشش کرتا رہے کہ جو لوگ اس کے زیر اثر آئے ہیں ان کے اندر مکمل اعتقادی، اخلاقی اور عملی انقلاب رونما ہو جائے۔

اس کے بعد انہی لوگوں کو خواہ وہ تعداد میں کتنے ہی کم ہوں، دوسرے لوگوں میں اس طرز کی "کاشتکاری" کے لیے استعمال کیا جا سکے گا اور اپنی نگرانی و رہنمائی میں ان سے کام لے۔ اس طرح نتائج کے حصول میں دیر تو ضرور ہوگی اور ابتدائی رفتار کا سست رہے گی، لیکن اس سے جو نتائج بھی حاصل ہوں گے پائیدار ہوں گے اور پھر ایک فصل کے تیار ہو جانے کے بعد دوسری زمینوں میں یہ کاشت اضعافاً مضاعفہ کے تناسب سے پھیلتی چلی جائے گی۔

اس طرح خود ہمارے رفقا کی اپنی اخلاقی تربیت بھی بہترین طریقہ پر ہوگی۔ صبر کے ساتھ ایک مقصد کے لیے مسلسل اور مرتب کام کرنے کی عادت پڑے گی۔ اپنے نصب العین کی خاطر وقت، محنت اور مال خرچ کرنے کی خو پیدا ہوگی۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور سہارنے کی مشق ہوگی۔ دل اور دماغ پر رفتہ رفتہ وہ تخیل پوری طرح چھا جائے گا جسے دوسروں کے ذہن میں اتارنے کی فکر میں وہ ہر وقت لگے ہوں گے۔ اپنی ایک ایک کمزوری اور خامی اور اخلاقی و عملی کوتاہی دوسروں کے آئینے میں ان کے سامنے نمایاں ہوگی، اور اگر انھیں فی الواقع ایک داعی و مصلح کی حیثیت سے کام کرنا ہے تو وہ خود اپنے ہر نقص پر متنبہ ہو کر اسے دور کرنے کی سعی کریں گے۔ انسانی نفسیات کو سمجھنے اور زندگی کے حقیقی مسائل کو جاننے اور محسوس کرنے کا موقع ملے گا۔ طرح طرح کے اشخاص اور معاملات اور مسائل سے قریبی سابقہ پیش آئے گا۔ اپنا راستہ آپ بنانے اور دوسروں سے کام لینے کا ڈھنگ معلوم ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ لیڈر شپ کی وہ ابتدائی تربیت حاصل ہوگی جو آگے چل کر ہمارے اس کام کے لیے گروپ لیڈرس پیدا کرنے میں مددگار بن جائے گی۔

یہ وہ مصلحتیں ہیں جن کی بنا پر میں نے دہلی اور حیدرآباد کے اجتماعات میں رفقاء کو مشورہ دیا تھا کہ ان میں سے جو تعلیم یافتہ ہیں وہ اپنے اپنے محلہ یا گاؤں میں سے چند غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو علم کی طرف رغبت دلا کر باقاعدہ اپنے چارج میں لیں اور تعلیم بالغان کے ظاہری پردے میں بباطن اس امر کی سعی شروع کر دیں کہ جن آدمیوں کو انھوں نے اپنے چارج میں لیا ہے انھیں نہ صرف اپنے آئیڈیل کے مطابق مکمل مسلمان بنائیں گے بلکہ انہی کو آئندہ کے لیے اپنا رفیق کار بھی بنا لیں گے۔

مجھے امید ہے کہ تمام تعلیم یافتہ رفقا جلدی سے جلدی اس کام کی طرف توجہ کریں گے۔

تفہیم القرآن

(۱۶)

الاعراف

(از اول سورہ تا رکوع ۹)

اس سورہ کا نام اعراف اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں ایک مقام پر اصحاب الاعراف کا ذکر آیا ہے۔ گویا اسے "سورۂ اعراف" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ سورہ جس میں اعراف کا ذکر ہے"۔

اس کے مضامین پر غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول تقریباً وہی ہے جو سورۂ انعام کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کے بعد نازل ہوئی ہو اور ممکن ہے کہ اس سے پہلے، لیکن بہرحال اندازِ تقریر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ہے یہ اسی دور سے متعلق۔ لہٰذا اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دیباچہ پر ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا جو ہم نے سورۂ انعام پر لکھا ہے۔

اس سورہ کی تقریر کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطب ہیں (یعنی اہلِ مکہ) انھیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور ان کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عنقریب پیغمبر کو ان سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قبولِ رسالت کی دعوت دینے کے ساتھ ان کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی ہے ایسی ہی روش تم سے پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کر کے بہت بُرا انجام دیکھ چکی ہیں۔ پھر چونکہ ان

حجت تمام ہونے کے قریب آگئی ہے اس لیے تقریر کے آخری حصہ میں دعوت کا رُخ اُن سے ہٹ کر اہل کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب بھی کیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دور ختم پر آگیا ہے جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہوا کرتا ہے۔

اسی تقریر میں چونکہ خطاب کا رُخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے اس لیے ساتھ ساتھ دعوت رسالت کے اس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرنے اور سمع و طاعت کا عہد استوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔

سورہ کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو حکمت تبلیغ کے متعلق چند اہم ہدایات دی گئی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ انھیں نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور جبر و دشمنی کے مقابلہ میں صبر و ضبط سے کام لیں اور جذبات کے ہیجان میں مبتلا ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اصل مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ا، ل، م، ص۔ ایک کتاب تمہاری طرف نازل کی گئی ہے[1]، پس اے محمد! تمہارے دل میں اس سے کوئی جھجک نہ ہو[2]۔ اس کے اتارنے کی غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے (منکرین کو) ڈراؤ اور ایمان

---

[1] کتاب سے مراد یہی سورۂ اعراف ہے۔

[2] یعنی بغیر کسی جھجک اور خوف کے اسے لوگوں تک پہنچا دو اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرو کہ تمہاری دعوت کے مخالفین اس کا کیا استقبال کریں گے۔ وہ بگڑتے ہیں، بگڑیں۔ مذاق اڑاتے ہیں، اڑائیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں، بنائیں۔ دشمنی (باقی اگلے صفحہ پر درج ہے)

لانے والے لوگوں کو یاد دہانی ہو۲؎۔

لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو، اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۳؎ ——— مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔

ہیں اور زیادہ سخت ہوتے ہیں، ہو جائیں۔ تم بے کھٹکے اس پیغام کو پہنچاؤ اور اس کی تبلیغ میں ذرا باک نہ کرو۔

جس مفہوم کے لیے ہم نے لفظ جھجک استعمال کیا ہے، اصل عبارت میں اس کے لیے لفظ حَرَجٌ استعمال ہوا ہے۔ لغت میں حرج اس گھنی جھاڑی کو کہتے ہیں جس میں سے گزرنا مشکل ہو۔ دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے درمیان اپنا راستہ صاف نہ پا کر آدمی کا دل آگے بڑھنے سے رکے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ضیق صدر کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ (اے محمد ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تم دل تنگ ہوتے ہو) یعنی تمہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی اور مخالفت حق کا یہ حال ہے انہیں آخر کس طرح سیدھی راہ پر لایا جائے۔ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ (تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم پر وحی کیا جا رہا ہے اس میں سے کوئی چیز تم بیان کرنے سے چھوڑ دو اور اس بات سے دل تنگ ہو کہ وہ تمہاری دعوت کے جواب میں کہیں گے اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا)

۲؎ واضح رہے کہ اس سورہ کا اصل موضوع انذار ہے، یعنی لوگوں کو رسول کی دعوت قبول نہ کرنے کے نتائج سے ڈرانا۔ اسی لیے اس کے نازل کرنے کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے غافلوں کو چونکایا اور متنبہ کیا جائے۔ رہی اہل ایمان کی تذکیر (یاددہانی) تو وہ ایک ضمنی فائدہ ہے جو انذار کے سلسلہ میں خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔

۳؎ یہ اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے۔ اصل دعوت جو اس خطبہ میں دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم اسے درکار ہے، اور اپنے اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج

کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا[۹] یا دن کو آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب اُن پر آ گیا تو اُن کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے۔[۵]

ہے، ان سب کے لیے اُسے صرف اللہ رب العالمین ہی کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اسی ہدایت کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بھیجی ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریقِ کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

یہاں "اولیاء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، اس کی سرپرستی کا معترف ہو یا بہ شدت اس سے منکر۔

سلہ یعنی تمہاری عبرت کے لیے ان قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو خدا کی ہدایت سے منحرف ہو کر انسانوں اور شیطانوں کی رہنمائی پر چلیں اور آخر کار اس قدر بگڑیں کہ زمین پر ان کا وجود ایک ناقابلِ برداشت لعنت بن گیا اور خدا کے عذاب نے آکر ان کی نجاست سے دنیا کو پاک کر دیا۔

آخری فقرے سے مقصود دو باتوں پر متنبہ کرنا ہے۔ ایک یہ کہ تلافی کا وقت گذر جانے کے بعد کسی کا ہوش میں آنا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بے کار ہے۔ سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیانِ حق کی صداؤں کو بہرے کانوں سے سُنے جائے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ چکا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں بے شمار مثالیں تمہارے سامنے گذر چکی ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو چکتا ہے اور وہ اپنی مہلت کی حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک اسے آ پکڑتی ہے اور ایک مرتبہ پکڑ میں آ جانے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل اسے نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران میں ایک دو دفعہ نہیں سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ

پس یہ ضرور ہو کر رہنا ہے کہ ہم اُن لوگوں سے باز پرس کریں[5] گے جن کی طرف ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے[6] (کہ انھوں نے پیغام رسانی کا فرض کہاں تک انجام دیا اور انھیں اس کا کیا جواب ملا)۔

بھی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضرور ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے اور ہوش میں آنے کے لیے اُسی آخری ساعت کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت و اندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔

---

[5] باز پرس سے مراد روزِ قیامت کی باز پرس ہے۔ بدکار افراد اور قوموں پر دنیا میں جو عذاب آتا ہے وہ دراصل ان کے اعمال کی باز پرس نہیں ہے اور نہ ان کے جرائم کی پوری سزا ہے، بلکہ اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی مجرم جو چھوٹا پھر رہا ہو، اچانک گرفتار کر لیا جائے اور مزید ظلم و فساد کے مواقع اس سے چھین لیے جائیں۔ تاریخ انسانی ان گرفتاریوں کی بے شمار نظیروں سے بھری پڑی ہے اور یہ نظیریں اس بات کی ایک صریح علامت ہیں کہ انسان دنیا میں شترِ بے مہار کی طرح نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ اُوپر کوئی طاقت ہے جو ایک حدِ خاص تک اسے ڈھیل دیتی ہے، تنبیہات پر تنبیہات بھیجتی ہے کہ اپنی شرارتوں سے باز آجائے، اور جب وہ کسی طرح باز نہیں آتا تو اسے اچانک پکڑ لیتی ہے۔ پھر اگر کوئی اس تاریخی تجربہ پر غور کرے تو بآسانی یہ نتیجہ بھی نکال سکتا ہے کہ جو فرماں روا اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے اس نے ضرور ایسا ایک وقت مقرر کیا ہوگا جب ان سارے مجرموں پر عدالت قائم ہوگی اور ان سے ان کے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر کی آیت کو جس میں دنیوی عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، بعد والی آیت کے ساتھ لفظ "پس" کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، گویا اس دنیوی عذاب کا بار بار واقع ہونا آخرت کی باز پرس کے یقیناً واقع ہونے پر ایک دلیل ہے۔

[6] اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی باز پرس سراسر رسالت ہی کی بنیاد پر ہوگی۔ ایک طرف پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نوعِ انسانی تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا اور دوسری طرف جن لوگوں تک رسولوں کا پیغام پہنچا ان سے سوال کیا جائے گا کہ اس پیغام کے ساتھ تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک نبی کا پیغام نہ پہنچا ہو ان کے بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مقدمہ کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ لیکن جن اشخاص و اقوام تک پیغمبروں کی تعلیم پہنچ چکی ہے ان کے متعلق قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ اپنے کفر و انکار اور

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگذشت ان کے آگے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔

اور وزن اس روز عین حق ہوگا[1]۔ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے

ہلکے رہیں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے[2] کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ

ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے۔

ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا،

مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔ ع ۱

ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت دی، پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ

فسق و نافرمانی کے لیے کوئی حجت نہ پیش کر سکیں گے اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ حسرت و ندامت کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے جہنم کی راہ لیں۔

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روز خدا کی میزانِ عدل میں وزن اور حق دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی ہوں گے۔ حق کے سوا کوئی چیز وہاں وزنی نہ ہوگی اور وزن کے سوا کوئی چیز حق نہ ہوگی۔ جس کے ساتھ جتنا حق ہوگا اتنا ہی وہ باوزن ہوگا اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا، کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر لحاظ نہ کیا جائے گا۔ باطل کی پوری زندگی خواہ وہ دنیا میں کتنی ہی طویل و عریض رہی ہو اور کتنے ہی بظاہر شاندار کارنامے اس کی پشت پر ہوں، اُس ترازو میں سراسر بے وزن قرار پائے گی۔ باطل پرست جب اس میزان میں تولے جائیں گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ دنیا میں جو کچھ وہ مدت العمر کرتے رہے وہ سب ایک پرِ کاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ یہی بات ہے جو سورۂ کہف کی آخری آیات میں فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتے رہے اور اللہ کی آیات سے انکار کر کے جن لوگوں نے یہ سمجھتے ہوئے کام کیا کہ انجام کار کوئی آخرت نہیں ہے اور کسی کو حساب نہیں دینا ہے ان کے کارنامۂ زندگی کو ہم آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے۔

[2] اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ انسان کا کارنامۂ زندگی دو پہلوؤں میں تقسیم ہوگا۔ ایک مثبت پہلو اور دوسرا منفی پہلو۔ مثبت پہلو میں صرف حق کو جاننا اور ماننا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا شمار ہوگا، اور آخرت میں اگر کوئی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی تو وہ

کرو۔[11] اس حکم پر سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔

بس یہی ہوگی۔ بخلاف اس کے حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہش نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوئے غیرِ حق کی راہ میں کرتا ہے وہ سب منفی پہلو میں جگہ پائے گا اور صرف یہی نہیں کہ یہ منفی پہلو بجائے خود بے قدر ہو گا بلکہ یہ آدمی کے مثبت پہلوؤں کی قدر بھی گھٹا دے گا۔

پس آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس کے کارنامۂ زندگی کا مثبت پہلو اس کے منفی پہلو پر غالب ہو اور نقصانات میں بہت کچھ دے دلا کر بھی اس کے حساب میں کچھ نہ کچھ بچا رہ جائے۔ رہا وہ شخص جس کی زندگی کا منفی پہلو اس کے تمام مثبت پہلوؤں کو دبا لے تو اس کا حال بالکل اس دیوالیہ تاجر کا سا ہو گا جس کی ساری پونجی خساروں کا بھگتان بھگتنے اور مطالبات ادا کرنے ہی میں کھپ جائے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ مطالبات اس کے ذمہ باقی رہ جائیں۔

---

[10] تقابل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ رکوع ۴۔

سورۂ بقرہ میں حکم سجدہ کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان سے شبہ ہو سکتا تھا کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت کے لیے دیا گیا۔ مگر یہاں وہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔ یہاں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدم ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کے فردِ اول ہونے کی حیثیت سے تھا۔

اور یہ جو فرمایا کہ "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت دی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو"، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادۂ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک زندہ انسان کی حیثیت سے آدم وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ ص رکوع ۵ میں ہے اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۚ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ (تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا)۔ اس آیت میں وہی تین مراتب ایک

(بقیہ حاشیہ) دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں، یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک کر آدم کو وجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورۂ حجر رکوع ۳ میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (اور تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا)۔

تخلیقِ انسانی کے اس آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکتے کہ موادِ ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا، پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی، اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی۔ لیکن بہرحال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت اُن نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں سائنس کے نام سے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبۂ انسانیت تک پہنچا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کے طویل خط میں کوئی نقطۂ خاص ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر "نوعِ انسانی" کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے، اُس کی تاریخ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً کوئی رشتہ نہیں رکھتی، وہ اول روز سے انسان ہی بنایا گیا تھا اور خدا نے کامل انسانی شعور کے ساتھ پوری روشنی میں اُس کی ارضی زندگی کی ابتدا کی تھی۔

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نقطۂ نظر ہیں اور ان سے انسانیت کے دو بالکل مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجیے تو آپ کو انسان اصلِ حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا، اس کی زندگی کے جملہ قوانین، حتیٰ کہ اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول اُن قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے، اور اُس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری طرزِ عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ

پوچھا "تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟"

بولا "میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے"۔

فرمایا "اچھا تو یہاں سے نیچے اتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔ نکل جا کہ درحقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں"[1]۔

دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات اور صنائع اور تمدنی آسائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں، انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے "انسان" ہونے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ آپ کی نگاہ میں وہ "حیوان ناطق" یا "متمدن جانور" (Social animal) نہیں ہوگا بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر اوپر کے زاویۂ نظر سے یکسر مختلف ہو جائے گی۔ آپ انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفۂ حیات اور ایک دوسرا ہی نظامِ اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالمِ اسفل کے بجائے عالمِ بالا کی طرف اٹھنے لگے گی۔

---

[1] اصل میں لفظ صَاغِرِیْنَ استعمال ہوا ہے۔ صَاغِر کے معنی ہیں الراضی بالذل، یعنی وہ جو ذلت اور صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتابی کرنا کہ اپنی عزت و بزرگی کا جو تصور تو نے خود قائم کر لیا ہے اس کے لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجب توہین نظر آتا ہے، یہ دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ تو خود اپنی ذلت چاہتا ہے۔ بڑائی کا جھوٹا پندار، عزت کا بے بنیاد ادعا، اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر فائز سمجھ بیٹھنا، تجھے بڑا اور ذی عزت اور بزرگ نہیں بنا سکتا بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل اور پست ہی بنائے گا اور اپنی اس ذلت و خواری کا سبب تو آپ ہی ہوگا۔

18

بولا "مجھے اُس دن تک مہلت دے جب کہ یہ سب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے"۔

فرمایا "تجھے مہلت ہے"۔

بولا "بس تو جیسا تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا، آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا"۔[۱]

[۱] یہ وہ چیلنج تھا جو ابلیس نے خدا کو دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مہلت جو آپ نے مجھے قیامت تک کے لیے دی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور صرف کر دوں گا کہ انسان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو آپ نے میرے مقابلہ میں اسے عطا کی ہے۔ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ کیسا ناشکرا، کیسا نمک حرام، کیسا احسان فراموش ہے۔

یہ مہلت جو شیطان نے مانگی تھی اور جو خدا نے اسے عطا فرما دی اس سے مراد محض وقت ہی نہیں ہے بلکہ اُس کام کا موقع بھی ہے جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ یعنی اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے انسان کو بہکانے اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی نااہلی ثابت کرنے کا موقع دیا جائے، اور یہ موقع اللہ تعالیٰ نے اسے دے دیا۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۷ میں اس کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دے دیا کہ آدم اور اس کی اولاد کو راہِ راست سے ہٹا دینے کے لیے جو جو چالیں وہ چلنا چاہتا ہے چلے، ان چال بازیوں سے اسے روکا نہیں جائے گا بلکہ وہ سب راہیں کھلی رہیں گی جن سے وہ انسان کو فتنہ میں ڈالنا چاہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ، یعنی میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار نہ ہوگا، تو صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی امیدیں دلائے، بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرے، لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر ان کو غلط راستوں کی طرف دعوت دے، مگر یہ طاقت تجھے نہیں دی جائے گی کہ انھیں زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے جائے اور اگر وہ راہِ راست پر چلنا چاہیں بھی تو نہ چلنے دے۔ یہی وہ بات ہے جو سورۂ ابراہیم رکوع ۴ میں فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں عدالتِ الٰہی سے فیصلہ صادر ہو جانے کے بعد شیطان اپنے پیروانوں سے کہے گا وَمَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ

فرمایا "نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا! یقین رکھ کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے ان سے اور تجھ سے جہنم کو بھر دوں گا۔ اور اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں اس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے"۔

پھر شیطان نے ان کو بہکایا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا "تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے"۔ اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔

اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے۔

تب ان کے رب نے انھیں پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟"

فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں کہ میں نے اپنی پیروی پر تمہیں مجبور کیا ہو، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنی راہ پر بلایا اور تم نے میری دعوت قبول کر لی، لہٰذا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

اور یہ جو شیطان نے خدا پر الزام عائد کیا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی معصیت کی ذمہ داری خدا پر ڈالتا ہے۔ اس کو شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدے کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنے میں ڈالا اور میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کر دیا کہ میں نے تیری نافرمانی کی۔ گویا اس احمق کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوری پکڑی نہ جاتی بلکہ جس پندار غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کھلی

دونوں بول اٹھے "اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے"۔[لے]

ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرے سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

سلے اس قصے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرت انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہی تھی کہ انسان کے اس جذبۂ شرم و حیا پر ضرب لگائے اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو صنفی معاملات میں بدراہ کر دے۔ بالفاظ دیگر اپنے حریف انسان کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملہ کے لیے تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا صنفی پہلو تھا، اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اس محافظ فصیل پر لگائی جو شرم و حیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔

(۳) یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اسے اپنے جال میں پھانسنے کے لیے داعیٔ شر کو خیر خواہی کے بھیس ہی میں آنا پڑتا ہے۔

(۴) انسان کے اندر معالی امور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیات جاوداں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعہ سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے اپیل کیا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے، اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اسے الٹا پستی کی طرف لے جائے۔

(بقیہ حاشیہ) (۵) عام طور پر یہ مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوا کو دام فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدم کو پھانسنے کے لیے آلۂ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوا کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبہ کو گرانے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں۔

(۶) یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے کہ شجر ممنوعہ کا مزا چکھتے ہی آدم و حوا کے ستر کھل جانا اس درخت کی کسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا ستر اپنے انتظام سے ڈھانکا تھا۔ جب انھوں نے حکم کی خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت ان سے ہٹالی گئی، ان کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود ان کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا گیا کہ اپنی پردہ پوشی کا انتظام خود کریں اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں، اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سعی نہ کریں تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں۔ یہ گویا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ انسان جب خدا کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سویر، اس کا پردہ کھل کر رہے گا۔ اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید و حمایت اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیع فرمان رہے گا، اطاعت کے حدود سے قدم باہر نکالنے کے بعد اسے خدا کی تائید ہرگز حاصل نہ ہو گی بلکہ اسے خود اس کے اپنے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ وہی مضمون ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اور اسی کے متعلق حضور نے دعا فرمائی ہے کہ اللھم رحمتک ارجو فلا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین۔ (خدایا میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں پس مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے نفس کے حوالے نہ کر)۔

(۷) شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو اس کے مقابلہ میں انسان کو دی گئی ہے۔ لیکن پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان اپنے رب کے امر کی فرمان برداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی یہ کمزوری ضرور ظاہر ہو گئی کہ وہ اپنے حریف کے فریب میں آکر

(بقیہ حاشیہ) اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے، مگر بہر حال اس اولین مقابلہ میں یہ قطعی ثابت ہوگیا کہ انسان اپنے اخلاقی مرتبہ میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا، اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا پر اللہ کے امر کی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی، اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا بلکہ شیطان کے بہکانے سے کیا، شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ داعی شر کو داعی خیر بن کر اس کے سامنے آنا پڑا، پستی کی طرف وہ پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ یہ راستہ اسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔ ثالثاً شیطان کو جب تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے اور بندگی کی طرف پلٹ آنے کے بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے قصور پر متنبہ کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ نادم ہوا، اپنے قصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

(۸) اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے بالکل متمیز ہوگئیں۔ خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے، خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کرے، متنبہ کیے جانے کے باوجود پورے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر اصرار کیے چلا جائے، اور جو لوگ طاعت کی راہ چل رہے ہوں ان کو بھی بہکانے اور معصیت کی راہ پر لے آنے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اول تو وہ شیطانی اغوا کی مزاحمت کرے اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و طاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس قصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہوگیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین یہ کرنا مقصود ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو یہ شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمھارا خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطین جن وانس کو اپنا ولی و سرپرست بنانا، اور یہ تمھارا پے در پے تنبیہات کے باوجود اپنی غلطی پر اصرار کیے چلے جانا، یہ دراصل خالص شیطانی رویہ ہے۔ تم اپنے ازلی دشمن کے دام میں گرفتار ہو گئے ہو اور اس سے مکمل شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام پھر وہی ہے جس سے خود شیطان دوچار ہونے والا ہے۔ اگر تم حقیقت

فرمایا "اتر جاؤ،[1] تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور سامانِ زیست ہے۔" اور فرمایا "وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور وہیں سے تم کو آخرکار نکالا جائے گا۔"

ع۲ اے اولادِ آدم![2] ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور

میں خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو اور کچھ بھی ہوش تم میں باقی ہے تو سنبھلو اور وہ راہ اختیار کرو جو آخرکار تمہارے باپ اور تمہاری ماں آدم و حوا نے اختیار کی تھی۔

---

[1] یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو جنت سے اُتر جانے کا حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انھیں معاف کر دیا۔ لہٰذا اس حکم میں سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہ اس منشا کی تکمیل ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔ اس کی تشریح ہم سورۂ بقرہ رکوع ۴ کے حواشی میں کر چکے ہیں۔

[2] یہاں قصۂ آدم و حوا کے ایک خاص پہلو سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہلِ عرب کے سامنے خود ان کی اپنی زندگی کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دہی فرمائی جا رہی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض، یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انھیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور وہ نیک کام سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عرب ہی کی خصوصیت نہ تھی، دنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں، اس لیے خطاب اہلِ عرب کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے، اور سارے بنی آدم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود

تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔[۱۵]

ہے تم اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیتے اور اس نے تمہیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمہارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے کہ رسولوں کی رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

۱۵؎ ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں:۔

اوّل یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی ہے۔ بلکہ حیا اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ انسان کے اعضائے صنفی کو اس کے لیے محض اعضائے صنفی ہی نہیں بلکہ سَوْءَةٌ بھی بنایا ہے جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اعلان و اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے کوئی بنا بنایا لباس اس کو نہیں دیا ہے بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا ہے (اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا)، تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رو سے انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سَوْاٰة کو ڈھکے اور اس کی طبعی ضرورت موخر ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے ریش یعنی جسم کی آرائش اور موسمی اثرات سے بدن کی

یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے[۱۵]۔ ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیتا، کیا تم اللہ کا نام

حفاظت کا ذریعہ) ہو۔ اس باب میں بھی فطرۃً انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ اُن کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا لیش ہونا ہے۔ رہا اس کا ستر پوشش ہونا تو اُن کے اعضا صنفی سرے سے سوأۃ ہی نہیں ہیں کہ انھیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جبلت میں کوئی داعیہ موجود ہو اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جائے یا ان کی فطرتوں پر بذریعۂ الہام نازل کیا جائے۔ لیکن انسانوں نے جب شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر الٹ گیا۔ اُس نے اپنے ان شاگردوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمہارے لیے لباس کی ضرورت بعینہٖ وہی ہے جو حیوانات کے لیے ریش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سوأۃ کو چھپانے والی چیز ہونا، تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضا سوأۃ نہیں ہیں اسی طرح تمہارے یہ اعضا بھی سوأۃ نہیں، محض اعضائے صنفی ہی ہیں۔

سوم یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ستر پوش اور وسیلۂ زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر ان ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملہ میں اس خیر مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح ان لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنھوں نے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سرپرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غلطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ یہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اوپر جن حقائق کی طرف ہم نے

ے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں ؟ اے محمد ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے، اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔ جس طرح اُس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔[۱۸] ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انھوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو[۱۹] اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

اشارہ کیا ہے انھیں اگر تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو بآسانی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

(حاشیہ ۲۲۲) [۱۷] اشارہ ہے اہل عرب کے برہنہ طواف کی طرف۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، وہ اس حیثیت سے ساتھ طواف کرنے کو ایک مذہبی فعل سمجھتے تھے اور ان کا قول تھا کہ اللہ نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱۸] مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو تمھاری ان بیہودہ رسموں سے کیا تعلق۔ اُس نے جس دین کی تعلیم دی ہے اس کے بنیادی اصول تو یہ ہیں کہ :۔

انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے

عبادت میں اپنا رُخ ٹھیک رکھے، یعنی خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک اس کی عبادت میں نہ ہو معبود حقیقی کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت و غلامی اور عجز و نیاز کا رُخ ذرا نہ پھرے۔

رہنمائی اور تائید و نصرت، اور نگہبانی و حفاظت کے لیے خدا ہی سے دعا مانگے، مگر یہ دعا صرف اسی حالت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ آدمی پہلے اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کر چکا ہو، یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور بندگیٔ اغیار پر چلایا جا رہا ہو اور مدد خدا سے مانگی جائے کہ اے خدا بغاوت جو ہم تجھ سے کر رہے ہیں اس میں ہماری مدد فرما

ع۳

اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ [۲۱]

اے محمدؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں [۲۲] ؟ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان

اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہوا ہے اسی طرح ایک دوسرے عالم میں بھی اس کو پیدا کیا جائے گا۔

۲۰ یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑے ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی محض اپنا ستر چھپا لے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں ستر پوشی بھی ہو اور زینت بھی۔ یہ حکم اس غلط روی کی تردید کے لیے ہے جس پر جہلا اپنی عبادتوں میں عمل کرتے رہے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ برہنہ یا نیم برہنہ ہو کر اور اپنی ہیئتوں کو بگاڑ کر خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس کے برعکس خدا کہتا ہے کہ اپنی زینت سے آراستہ ہو کر ایسی وضع میں عبادت کرنی چاہیے جس کے اندر برہنگی تو کیا، ناشائستگی کا بھی شائبہ تک نہ ہو۔

---

۲۱ یعنی خدا کو تمہاری فاقہ کشی اور طیبات رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجالانے کے لیے یہ کسی درجہ میں بھی مطلوب ہو، بلکہ اس کی عین خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بخشے ہوئے پاک رزق سے متمتع ہو۔ اس کی شریعت میں اصل گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے خواہ یہ تجاوز حلال کو حرام کر لینے کی شکل میں ہو یا حرام کو حلال کر لینے کی شکل میں۔

۲۲ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے اللہ کا منشا تو بہرحال یہ نہیں ہو سکتا کہ انھیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی نظامِ اخلاق و معاشرت ایسا ہے جو انھیں حرام یا قابلِ نفرت یا ارتقائے روحانی میں سدِّ راہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

لانے والوں کے لیے ہیں، اور قیامت کے روز تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔[1] اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام ۔۔۔ خواہ کھلے ہوں یا چھپے[2] ۔۔۔ اور گناہ[3] اور حق کے خلاف زیادتی[4] اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی[5] اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات

---

[1] یعنی حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ تمام چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان ہی کے لیے ہیں، کیونکہ وہی خدا کی وفادار رعایا ہیں اور حق نمک صرف نمک حلالوں ہی کو پہنچتا ہے۔ لیکن دنیا کا موجودہ انتظام چونکہ آزمائش اور مہلت کے اصول پر قائم کیا گیا ہے اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں نمک حراموں پر بھی تقسیم ہوتی رہتی ہیں اور بسا اوقات نمک حلالوں سے بڑھ کر انھیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں جہاں کا سارا انتظام خالص حق کی بنیاد پر ہوگا اور جہاں ہر چیز اُس نرالی قسم کے ترازو سے تولی جائے گی جس کے پلڑے ایمان و اخلاق کے وزن سے جھکیں گے اور مال و دولت کے بڑے سے بڑے انباروں کا بھی کوئی وزن نہ دکھائیں گے، زندگی کی آرائشیں اور رزق کے طیبات سب کے سب محض نمک حلالوں کے لیے مخصوص ہوں گے اور وہ نمک حرام ان میں سے کچھ نہ پا سکیں گے جنھوں نے اپنے رب کے رزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔

[2] اس کی تشریح سورۂ انعام رکوع ۱۹ کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔

[3] اصل میں لفظ اِثْم استعمال ہوا ہے جس کے اصل معنی کوتاہی کے ہیں۔ آثِمَہ اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز روی پر قادر ہو اور پھر سست چلے۔ اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم پیدا ہوا ہے، یعنی انسان کا اپنے رب کی اطاعت و فرماں برداری میں قدرت و استطاعت کے باوجود، کوتاہی کرنا اور اس کی رضا کو پہنچنے میں قصور دکھانا۔

[4] یعنی اپنی حد سے تجاوز کر کے ایسے حدود میں قدم رکھنا جن کے اندر داخل ہونے کا آدمی کو حق نہ ہو۔ اس تعریف کی رو سے وہ لوگ بھی باغی قرار پاتے ہیں جو بندگی کی حد سے نکل کر خدا کے ملک میں خود مختارانہ رویہ اختیار

کہو جس کے متعلق تمھیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔

ہر قوم کے لیے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی۔ (اور یہ بات اللہ نے آغازِ تخلیق ہی میں صاف فرما دی تھی کہ) اے بنی آدم! یاد رکھو، اگر تمھارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمھیں میری آیات سنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں ہے، اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی برتیں گے وہی اہلِ دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے[سلہ] ظاہر ہے کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائے۔ ایسے لوگ اپنے نوشتۂ تقدیر

کرتے ہیں اور وہ بھی جو خدا کی خدائی میں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجاتے ہیں اور وہ بھی جو بندگانِ خدا کے حقوق پر دست درازی کرتے ہیں۔

شہ یعنی جو، زندہ یا مردہ انسان یا جن یا فرشتے کے متعلق خدا نے خود کبھی نہیں کہا کہ وہ جوہرِ الوہیت میں میرا شریک ہے یا میری صفات میں سے کوئی صفت رکھتا ہے یا میرے خداوندانہ اختیارات میں سے کوئی اختیار استعمال کر سکتا ہے یا اُن حقوق میں سے کسی حق کا مستحق ہے جو مجھے اپنی مخلوق پر حاصل ہیں، اس کو محض اپنے وہم و گمان سے بطور خود خدا کا شریک قرار دے لینا اُن بڑے جرائم میں سے ہے جنھیں اللہ نے حرام کیا ہے۔

سلہ یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم و حوّا علیہما السلام کے جنت سے اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ رکوع ۴ - طٰہٰ رکوع ۷)۔ لہٰذا یہاں بھی اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوعِ انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اسی وقت یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی تھی۔

کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے [سلہ] یہاں تک کہ وہ گھڑی آ جائے گی جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے۔ اس وقت وہ اُن سے پوچھیں گے کہ بتاؤ، اب کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کو تم خدا کے بجائے پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ "سب ہم سے گم ہو گئے" اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ ہم واقعی منکرِ حق تھے۔ اللہ فرمائے گا جاؤ، تم بھی اسی جہنم میں چلے جاؤ جس میں تم سے پہلے گذرے ہوئے گروہ جن و انس جا چکے ہیں۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا، حتیٰ کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہم کو گمراہ کیا لہٰذا انھیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔ جواب میں ارشاد ہوگا، ہر ایک کے لیے دوہرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو [سکہ]

سلہ یعنی دنیا میں جتنے دن ان کی مہلت کے مقرر ہیں یہاں رہیں گے اور جس قسم کی بظاہر اچھی یا بری زندگی گذارنا ان کے نصیب میں ہے گزار لیں گے۔

سکہ یعنی بہرحال ہر گروہ کسی کا خلف تھا تو کسی کا سلف بھی تھا۔ اگر ایک گروہ کے اسلاف نے اس کے لیے فکر و عمل کی گمراہیوں کا ورثہ چھوڑا تھا تو وہ بھی اپنے اخلاف کے لیے ویسا ہی ورثہ چھوڑ گیا۔ اگر اس کے گمراہ ہونے کی کچھ ذمہ داری اس کے اسلاف پر عائد ہوتی ہے تو اس کے اخلاف کی گمراہی کا اچھا خاصا بار خود اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا کہ ہر ایک کے لیے دوہرا عذاب ہے، ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا، ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کے لیے جرائم پیشگی کی میراث چھوڑنے کی۔

حدیث میں اسی مضمون کی توضیح یوں بیان فرمائی گئی ہے کہ من ابتدع بدعۃ ضلالۃ لا یرضاھا اللہ و رسولہ کان علیہ من الاثم مثل آثام من عمل بھا لا ینقص ذالک من اوزارھم شیئا۔ یعنی جس نے کسی نئی گمراہی کا آغاز کیا جو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، تو اس پر ان سب لوگوں کے گناہ کی ذمہ داری عائد ہوگی جنھوں نے اس کے نکالے ہوئے طریقہ پر عمل کیا بغیر اس کے کہ خود ان عمل کر(نے)

(بقیہ حاشیہ) والوں کی اپنی ذمہ داری میں کوئی کمی ہو۔ اور لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمها لانه اول من سن القتل۔ یعنی دنیا میں جو انسان بھی ظلم کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے اس کے خونِ ناحق کا ایک حصہ آدم کے اس پہلے بیٹے کو پہنچتا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا، کیونکہ قتل انسان کا راستہ سب سے پہلے اسی نے کھولا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا گروہ کسی غلط خیال یا غلط رویّہ کی بنا ڈالتا ہے وہ صرف اپنی ہی غلطی کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں جتنے انسان اس سے متاثر ہوتے ہیں، ان سب کے گناہ کی ذمہ داری کا بھی ایک حصہ اس کے حساب میں لکھا جاتا رہتا ہے، اور جب تک اس کی اس غلطی کے اثرات چلتے رہتے ہیں اس کے حساب میں ان کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی نیکی یا بدی کا صرف اپنی ذات کی حد تک ہی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس امر کا بھی جواب دہ ہے کہ اس کی نیکی یا بدی کے کیا اثرات دوسروں کی زندگیوں پر مترتب ہوئے۔

مثال کے طور پر ایک زانی کو لیجیے۔ جن لوگوں کی تعلیم و تربیت سے، جن کی صحبت کے اثر سے، جن کی بری مثالیں دیکھنے سے، اور جن کی ترغیبات سے اس شخص کے اندر زناکاری کی صفت نے ظہور کیا وہ سب اس کے زناکار بننے میں حصہ دار ہیں اور خود ان لوگوں نے اوپر جہاں جہاں سے بدنظری و بدنیتی اور بدکاری کی میراث پائی ہے وہاں تک اس کی ذمہ داری پہنچتی ہے حتّٰی کہ یہ سلسلہ اس اوّلین انسان پر منتہی ہوتا ہے جس نے سب سے پہلے نوعِ انسانی کو خواہشِ نفس کی تسکین کا یہ غلط راستہ دکھایا۔ یہ اس زانی کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کے اسلاف اور اس کے ہم عصروں سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر وہ خود بھی اپنی زناکاری کا ذمہ دار ہے۔ اس کو بھلے اور بُرے کی جو تمیز دی گئی تھی، اس میں ضمیر کی جو طاقت رکھی گئی تھی، اس کے اندر ضبطِ نفس کی جو قوت ودیعت کی گئی تھی، اس کو نیک لوگوں سے خیر و شر کا جو علم پہنچا تھا، اس کے سامنے اخیار کی جو مثالیں موجود تھیں، اس کو صنفی بدعملی کے بُرے نتائج سے جو واقفیت تھی، ان میں سے کسی چیز سے بھی اس نے فائدہ نہ اٹھایا اور اپنے آپ کو نفس کی اس اندھی خواہش کے حوالے کر دیا جو صرف اپنی تسکین چاہتی ہے خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ یہ اس کے حساب کا وہ حصہ ہے جو اس کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر یہ شخص اس بدی کو جس کا اکتساب اس نے کیا اور جسے خود اپنی سعی سے وہ پرورش کرتا رہا، دوسروں میں پھیلانا شروع کرتا ہے۔ کسی مرضِ خبیث کی چھوت کہیں سے لگا لا

(بقیہ حاشیہ) ہے اور اسے اپنی نسل میں اور خدا جانے کن کن نسلوں میں پھیلا کر نہ معلوم کتنی زندگیوں کو خراب کر دیتا ہے۔ کہیں اپنا نطفہ چھوڑ آتا ہے اور جس بچہ کی پرورش کا بار اُسے خود اٹھانا چاہیے تھا اسے کسی اور کی کمائی کا ناجائز حصہ دار، اس کے بچوں کے حقوق میں زبردستی کا شریک، اس کی میراث میں ناحق کا حق دار بنا دیتا ہے اور اس حق تلفی کا سلسلہ نہ معلوم کتنی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ کسی دوشیزہ لڑکی کو پھسلا کر بداخلاقی کی راہ پر ڈالتا ہے اور اس کے اندر وہ بری صفات ابھار دیتا ہے جو اس سے منعکس ہو کر نہ معلوم کتنے خاندانوں اور کتنی نسلوں تک پہنچتی ہیں اور کتنے گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ اپنی اولاد، اپنے اقارب، اپنے دوستوں اور اپنی سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے سامنے اخلاق کی ایک بُری مثال پیش کرتا ہے اور نہ معلوم کتنے آدمیوں کے چال چلن خراب کرنے کا سبب بن جاتا ہے جس کے اثرات بعد کی نسلوں میں مدتہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں۔ یہ سارا فساد جو اس شخص نے سوسائٹی میں برپا کیا، انصاف چاہتا ہے کہ یہ بھی اس کے حساب میں لکھا جائے اور اس وقت تک لکھا جاتا رہے جب تک اس کی پھیلائی ہوئی خرابیوں کا سلسلہ دنیا میں چلتا رہے۔ اسی پر نیکی کو بھی قیاس کر لینا چاہیے کہ جو نیک ورثہ اپنے اسلاف سے ہم کو ملا ہے اُس کا اجر اُن سب لوگوں کو پہنچنا چاہیے جو ابتدائے آفرینش سے ہمارے زمانہ تک اس کے منتقل کرنے میں حصہ لیتے رہے ہیں، اور اس ورثہ کو نئے سرے سے سنبھالنے اور ترقی دینے میں جو خدمت ہم نے انجام دی ہے اس کا اجر ہمیں ملنا چاہیے، اور اپنی سعی خیر کے جو نقوش و اثرات ہم دنیا میں چھوڑ جائیں انھیں بھی ہماری بھلائیوں کے حساب میں اس وقت تک برابر درج ہوتے رہنا چاہیے جب تک یہ نقوش باقی رہیں اور ان کے اثرات کا سلسلہ نوعِ انسانی میں چلتا رہے۔

جزا کی یہ صورت جو قرآن پیش کر رہا ہے، ہر صاحبِ عقل انسان تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے۔ اور اگر اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ان لوگوں کی ساری غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں جنھوں نے جزا کے لیے اسی دنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھا ہے، یا یہ گمان کیا ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزا تناسخ کی صورت میں مل سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ تو انسانی اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی وسعتوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔ ایک انسان آج اپنی پچاس ساٹھ سال کی زندگی میں جو اچھے یا برے کام کرتا ہے ان کی ذمہ داری

(بقیہ حاشیہ) میں نہ معلوم اور کی کتنی نسلیں شریک ہیں جو گزر چکیں، اور آج یہ ممکن نہیں کہ انھیں اس کی جزا یا سزا پہنچ سکے۔ پھر اُس شخص کے یہ اچھے یا بُرے اعمال جو وہ آج کر رہا ہے اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ ان کے اثرات کا سلسلہ آئندہ صدہا برس تک چلتا رہے گا، ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک پھیلے گا اور اس کے حساب کا کھاتہ اس وقت تک کھلا رہے گا جب تک یہ اثرات چل رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ آج ہی اس دنیا کی زندگی میں اس شخص کو اس کے کسب کی پوری جزا مل جائے درآں حالے کہ ابھی اس کے کسب کے اثرات کا لاکھواں حصہ بھی رونما نہیں ہوا ہے۔ پھر اس دنیا کی محدود زندگی اور اس کے محدود امکانات سرے سے اتنی گنجائش ہی نہیں رکھتے کہ یہاں کسی کو اس کے کسب کا پورا بدلہ مل سکے۔ آپ کسی ایسے شخص کے جرم کا تصور کیجیے جو مثلاً دنیا میں ایک جنگِ عظیم کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس کی اس حرکت کے بے شمار بُرے نتائج ہزاروں برس تک اربوں انسانوں تک پھیلتے ہیں۔ کیا کوئی بڑی سے بڑی جسمانی، اخلاقی، روحانی، یا مادی سزا بھی جو اس دنیا میں دی جانی ممکن ہے، اُس کے اس جرم کی پوری منصفانہ سزا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح کیا دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انعام بھی جس کا تصور آپ کر سکتے ہیں، کسی ایسے شخص کے لیے کافی ہو سکتا ہے جو مدۃ العمر نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے کام کرتا رہا ہو اور ہزاروں سال تک بے شمار انسان جس کی سعی کے ثمرات سے فائدہ اٹھاتے رہے ہوں۔ عمل اور جزا کے مسئلے کو اس پہلو سے جو شخص دیکھے گا اسے یقین ہو جائے گا کہ جزا کے لیے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے جہاں تمام اگلی اور پچھلی نسلیں جمع ہوں، تمام انسانوں کے کھاتے بند ہو چکے ہوں، حساب کرنے کے لیے ایک علیم و خبیر خدا انصاف کی کرسی پر متمکن ہو، اور اعمال کا پورا بدلہ پانے کے لیے انسان کے پاس غیر محدود زندگی اور اس کے گرد و پیش جزا و سزا کے غیر محدود امکانات موجود ہوں۔

پھر اسی پہلو پر غور کرنے سے اہلِ تناسخ کی ایک اور بنیادی غلطی کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے جس میں مبتلا ہو کر انھوں نے آواگون کا چکر تجویز کیا ہے۔ ۔۔۔ اس حقیقت کو نہیں سمجھے کہ صرف ایک ہی مختصر سی پچاس سالہ زندگی کے کارنامے کا پھل پانے کے لیے اس سے ہزاروں گنی زیادہ طویل زندگی درکار ہے، کجا کہ اُس پچاس سالہ زندگی کے ختم ہوتے ہی ہماری ایک دوسری اور پھر تیسری ذمہ دارانہ زندگی اسی دنیا میں شروع ہو جائے اور ان زندگیوں میں بھی ہم مزید ایسے کام کرتے چلے جائیں

اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ (اگر ہم قابل الزام تھے) تو تمہی کو ہم پر کونسی فضیلت حاصل تھی، اب اپنی کمائی کے نتیجہ میں عذاب کا مزا چکھو۔[۱] ۴ع

جن کا اچھا یا برا پھل ہمیں ملنا ضروری ہو۔ اس طرح تو حساب بے باق ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھتا ہی چلا جائے گا اور اس کے بے باق ہونے کی نوبت کبھی آہی نہ سکے گی۔

---

[۱] اہل دوزخ کی اس باہمی تکرار کو قرآن مجید میں کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ سبا رکوع ۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "کاش تم دیکھ سکو اس موقع کو جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اور ایک دوسرے پر باتیں بنا رہے ہوں گے۔ جو لوگ دنیا میں کمزور بنا کر رکھے گئے تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بن کر رہے تھے، کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان کمزور بنائے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روک دیا تھا جب کہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے"۔ مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دنیا کے لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوئے۔ اگر ہم نے تمہیں خریدا تو تم خود بکنے کے لیے تیار تھے جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمہیں مادہ پرستی اور دنیا پرستی اور قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بد اعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بیزار اور دنیا کے پرستار تھے جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہا۔ اگر ہم نے تمہیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو ان چیزوں کی مانگ تو تمہارے ہی اندر موجود تھی جنہیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کر لیتے تھے۔ تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور بس تمہارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت روا تمہیں گھڑ کر دے دیے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم خدا سے بے پروا ہو کر دنیا کے کتے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمہ وہ لے لیں۔ ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمہیں فراہم کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک و بے مزہ دینداری اور پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بجائے نجات کا کوئی اور راستہ بنایا جائے جس میں نفس کے لیے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر پابندی کوئی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوشنما مذہب تمہارے لیے ایجاد کر دیے۔ غرض یہ کہ ذمہ داری تنہا ہمارے ہی اوپر نہیں ہے۔ تم

یقین جانو! جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کی ہے ان کے لیے آسمان کے دروازے ہرگز نہ کھولے جائیں گے۔ اُن کا جنت میں جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گذرنا۔ مجرموں کو ہمارے ہاں ایسا ہی بدلہ ملا کرتا ہے۔ ان کے لیے تو جہنم کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا۔ یہ ہے وہ جزا جو ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا ہے اور اچھے کام کیے ہیں ——— اور اس باب میں ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھیراتے ہیں ——— وہ اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کدورت ہوگی اسے ہم نکال دیں گے۔[1] اُن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ "تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا۔ ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ ہمارے رب کے بھیجے ہوئے رسول حق لے کر آئے تھے"۔ اُس وقت ندا

بھی برابر کے ذمہ دار ہو۔ ہم اگر گمراہی فراہم کرنے والے تھے تو تم اس کے خریدار تھے۔

---

[1] یعنی دنیا کی زندگی میں اِن نیک لوگوں کے درمیان اگر کچھ رنجشیں، بدمزگیاں اور آپس کی غلط فہمیاں رہی ہوں تو آخرت میں وہ سب دور کر دی جائیں گی، ان کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوجائیں گے اور وہ مخلص دوستوں کی حیثیت سے جنت میں داخل ہوں گے۔ کسی کو یہ دیکھ کر تکلیف نہ ہوگی کہ فلاں جو میرا مخالف تھا اور فلاں جو مجھ سے لڑا تھا اور فلاں جس نے مجھ پر تنقید کی تھی، آج وہ بھی اس ضیافت میں میرے ساتھ شریک ہے۔ اسی آیت کو پڑھ کر حضرت علی نے فرمایا تھا کہ مجھے امید ہے اللہ میرے اور عثمان اور طلحہ اور زبیر کے درمیان بھی صفائی کرا دے گا۔

اس آیت کو اگر ہم زیادہ وسیع نظر سے دیکھیں تو یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صالح انسانوں کے دامن پر اس دنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اِن داغوں سمیت انھیں جنت میں نہ لے جائے گا بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انھیں بالکل پاک صاف کر دے گا اور وہ بے داغ زندگی لیے ہوئے وہاں جائیں گے۔

آئے گی کہ "یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو تمھیں اُن اعمال کے بدلے میں ملی ہے جو تم کرتے رہے تھے"۔[ملہ]

پھر یہ جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے "ہم نے اُن سارے وعدوں کو ٹھیک

ملہ یہ ایک نہایت لطیف معاملہ ہے جو وہاں پیش آئے گا۔ اہلِ جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی بلکہ وہ خدا کی حمد و ثنا اور شکر و احسان مندی میں رطب اللسان ہوں گے اور کہیں گے کہ یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ ان پر اپنا احسان نہ جتائے گا بلکہ جواب میں ارشاد فرمائے گا تو یہ کہ تم نے یہ درجہ اپنی خدمات کے صلہ میں پایا ہے، یہ تمھاری اپنی محنت کی کمائی ہے جو تمھیں دی جا رہی ہے، یہ بھیک کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ تمھاری سعی کا اجر ہے، تمھارے کام کی مزدوری ہے، اور وہ باعزت روزی ہے جس کا استحقاق تم نے اپنی قوتِ بازو سے اپنے لیے حاصل کیا ہے۔ پھر یہ مضمون اس اندازِ بیان سے اور بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے جواب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ نہیں فرماتا کہ ہم یوں کہیں گے، بلکہ انتہائی شانِ کریمی کے ساتھ فرماتا ہے کہ جواب میں یہ ندا آئے گی۔

درحقیقت یہی معاملہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دُنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، اور اسی بنا پر وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ متکبر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں، شکر بجا لاتے ہیں، جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع اور رحیم و شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر آخرت کے بارے میں بھی وہ اپنے حسنِ عمل پر غرور نہیں کرتے کہ ہم تو ضرور بخشے ہی جائیں گے بلکہ اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتے ہیں، اپنے عمل کے بجائے خدا کے رحم اور فضل سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ڈرتے ہی رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے حساب میں لینے کے بجائے کچھ دینا ہی نہ نکل آئے۔ بخاری و مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اعلموا ان احدکم لن یدخلہ عملہ الجنۃ۔ خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ پہنچ جاؤ گے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا

پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کیے تھے؟" وہ جواب دیں گے ہاں۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ خدا کی لعنت اُن ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہو گی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے۔ یہ جنت میں داخل تو نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہیں[1]۔ یہ ہر ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے۔ جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ "سلامتی ہو تم پر"۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں

٤٥ کی طرف پھریں گی تو کہیں گے، اے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں میں نہ شامل کیجیو۔ پھر یہ اعراف کے لوگ دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ "دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ بھی نہ دے گا؟ آج انہی سے کہا گیا کہ داخل ہو جنت میں، تمہارے لیے نہ خوف ہے نہ رنج"۔

اور دوزخ کے لوگ جنت والوں کو پکاریں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہم پر ڈال دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اسی میں سے کچھ پھینک دو۔ وہ جواب دیں گے کہ "اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان منکرین حق پر حرام کر دی ہیں جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنا لیا تھا اور جنھیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ آج ہم بھی انھیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کی ملاقات کو بھولے

آپ بھی؟ فرمایا ہاں میں بھی، الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ منہ وفضل، الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے۔

---

[1] یعنی یہ اصحاب الاعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو ہی اتنا قوی ہو گا کہ جنت میں داخل ہو سکیں اور نہ منفی پہلو ہی اتنا خراب ہو گا کہ دوزخ میں جھونک دیے جائیں۔ اس لیے وہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک سرحد پر رہیں گے۔

رب اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے"۔[۳۵]

ہم اِن لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے[۳۶] اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے[۳۷]۔ اب کیا یہ اس کے سوا کسی اور بات کے منتظر ہیں کہ وہ

---

[۳۵] اہل جنت اور اہل دوزخ اور اصحاب الاعراف کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالم آخرت میں انسان کی قوتیں اُن حدود کے ساتھ محدود نہ ہوں گی جو یہاں پائی جاتی ہیں، بلکہ اُن کا پیمانہ اِس عالم سے بہت زیادہ وسیع ہوگا۔ وہاں آنکھوں کی بینائی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوگی کہ جنت اور دوزخ اور اعراف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، اور اسی طرح وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوگی کہ اِن مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی گفت و شنید کر سکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو عالم آخرت کے متعلق ہمیں قرآن میں ملتے ہیں، اس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دنیا کے قوانین طبیعی سے بالکل مختلف ہوں گے اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گی جو یہاں ہیں۔ جن لوگوں کے دماغ اس عالم طبیعی کے حدود میں اس قدر مقید ہیں کہ موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا وہ قرآن اور حدیث کے اِن بیانات کو بڑے اچنبھے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مذاق اڑا کر اپنی خفیف العقلی کا مزید ثبوت بھی دینے لگتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کا دماغ جتنا تنگ ہے زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

[۳۶] یعنی اس میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں کونسا رویہ درست ہے اور صحیح طرزِ زندگی کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات بھی قیاس یا گمان یا وہم کی بنیاد پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔

[۳۷] مطلب یہ ہے کہ اول تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی بجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی اگر ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہِ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو مانتے ہیں ان کی زندگی میں عملاً بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر

انجام سامنے آجائے جس کی یہ خبر دے رہی ہے[سلہ]؟ جس روز وہ انجام سامنے آگیا تو وہی لوگ جنھوں نے
اسے نظر انداز کر دیا تھا کہیں گے کہ "واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، پھر کیا اب ہمیں
کچھ سفارشی ملیں گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ
ہم پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کرکے دکھائیں[سلہ]" ـــــــــ انھوں نے اپنے
آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے تصنیف کر رکھے تھے آج ان سے گم ہو گئے۔ ع
درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[سٹلہ] پھر اپنے تخت

قبول کرتے ہی انسان کی ذہنیت، اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔

سلہ دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت معقول طریقہ سے صاف صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا، پھر اس کے سامنے کچھ لوگ صحیح راستہ پر چل کر مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں کہ غلط روی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی بہ نسبت راست روی اختیار کرکے ان کی زندگی کتنی بہتر ہو گئی ہے، مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ صرف اپنی غلط روی کی سزا پاکر ہی مانے گا کہ ہاں یہ غلط روی تھی۔ جو شخص نہ حکیم کے عاقلانہ مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفایاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے، وہ اب بستر مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی مہلک تھے۔

سلہ یعنی وہ دوبارہ اس دنیا میں واپس آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اُس وقت ہم نے نہ مانا تھا، اب مشاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں، لہٰذا اب اگر ہمیں دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو ہمارا طرزِ عمل وہ نہ ہوگا جو پہلے تھا۔

سٹلہ یہاں دن کا لفظ دَور (Period) کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ حج رکوع ۶ میں فرمایا کہ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن ہزار سال

سلطنت پر متمکن ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے

کے برابر ہے اس حساب سے جو تم لوگ لگاتے ہو)، اور سورہ معارج کی ابتدائی آیات میں فرمایا کہ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (فرشتے اور جبریل اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہے)

۱؎ خدا کے استواء علی العرش (تخت سلطنت پر متمکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی اس لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرما دیا ہو اور اسی کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جا رہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرماں روائی ہو اور اس پر متمکن ہو جانے سے مراد یہ ہو کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے اس کی زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہرحال استواء علی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا ہے، سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کی تابع ہے، ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کی جڑ کاٹنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خود سری کی ضلالت میں۔ خدا کو کائنات کے انتظام سے عملاً بے تعلق سمجھ لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ سمجھے اور ان کے آگے سر جھکائے، یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھے اور خود مختار بن بیٹھے۔

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ قرآن مجید میں خدا اور خلق کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ، اصطلاحات، استعارے اور انداز بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت و بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن کو پڑھتا ہو اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی "تصنیف" ہے اس زمانہ میں انسان کے ذہن

سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے، سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو! اسی کی خلق ہے
اور اسی کا امر ہے۔[۵] بڑا بابرکت ہے اللہ،[۶] سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔ اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے

پر شاہی نظام کا تسلط تھا اس لیے مصنف نے (جس سے مراد ان ظالموں کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ در اصل قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات کی ہے، اور حاکمیت (Sovereignty) جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے، اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے، لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو مذہبی معنوں میں واحد معبود بھی مانے اور سیاسی و تمدنی معنوں میں واحد سلطان (Sovereign) بھی تسلیم کرے۔

[۵] یہ اسی مضمون کی مزید تشریح ہے جو "استواء علی العرش" کے الفاظ میں مجملاً بیان کیا گیا تھا یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اُس میں حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے، بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیل و نہار کی گردش آپ سے آپ نہیں ہو رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے، جب چاہے وہ اُسے روک دے اور جب چاہے اس کے نظام کو تبدیل کر دے۔ سورج اور چاند اور تارے خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں بالکل مسخر ہیں اور مجبور غلاموں کی طرح بس وہی کام کیے جا رہے ہیں جو خدا ان سے لے رہا ہے۔

[۶] برکت کے اصل معنی ہیں نمو، افزائش اور بڑھوتری کے، اور اسی کے ساتھ اس لفظ میں رفعت و عظمت کا مفہوم بھی ہے اور ثبات اور جماؤ کا بھی۔ پھر ان سب مفہومات کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصور لازماً شامل ہے۔ پس اللہ کے

ہوسے اور چکنے چپکے، یقیناً وہ بندگی سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے[۱] اور

نہایت بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی کوئی حد نہیں ہے، بے حد و حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں، اور وہ بہت بلند و برتر ہستی ہے، کہیں جا کر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی، اور اس کی یہ بھلائی اور رفعت مستقل ہے، عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال ہو۔

---

[۱] زمین میں فساد برپا نہ کرو، یعنی زمین کے انتظام کو خراب نہ کرو۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق، معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرتا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر اصلاح عارض ہوتی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوجاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہاں انسان کی زندگی کی ابتدا جہالت و وحشت اور شرک و بغاوت اور اخلاقی بدنظمی سے نہیں ہوئی ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسانی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں اور اسے از سر نو درست کر دینے کے لیے جو پیغمبر وقتاً فوقتاً خدا نے بھیجے ہیں انھوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جنھوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور بنتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا

خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ[1]، یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری لیے ہوئے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں تو انھیں کسی مردہ سرزمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر (اسی مری ہوئی زمین سے) طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے۔ دیکھو، اس طرح ہم مردوں کو حالتِ موت سے نکالتے ہیں، شاید کہ تم اس مشاہدے سے سبق لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے خوب پھل پھول لاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا[2]۔ اس طرح ہم نشانیوں کو بار بار پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو شکر گزار ہونے

اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ وہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں۔

---

[1] اس فقرے سے واضح ہو گیا کہ اوپر کے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل یہی ہے کہ انسان خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست اور کارساز و کار فرما قرار دے کر مدد کے لیے پکارے۔ اور اصلاح اس کے سوا کسی دوسری چیز کا نام نہیں ہے کہ انسان کی اس پکار کا مرجع پھر سے محض اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں خوف بھی ہو تو اللہ سے ہو اور تمھاری امیدیں بھی اگر کسی سے وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمھاری قسمت بالکلیہ اس کی نظرِ عنایت پر منحصر ہے، فلاح و سعادت کو پہنچ سکتے ہو تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے، ورنہ جہاں تم اس کی اعانت سے محروم ہوئے پھر تمھارے لیے تباہی و نامرادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔

[2] یہاں ایک لطیف مضمون ارشاد ہوا ہے جس پر متنبہ ہو جانا اصل مدعا کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ بارش اور اس کی برکتوں کے ذکر سے اس مقام پر خدا کی قدرت کا بیان یا حیات بعد الممات کا اثبات مقصود نہیں ہے بلکہ دراصل یہاں تمثیل کے پیرایہ میں رسالت اور اس کی برکتوں کا اور اس کے ذریعہ سے خوب و زشت میں فرق اور خبیث و طیب

ع ۷ والے ہیں۔

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ [۴۷] اس نے کہا [۴۸] اے برادرانِ قوم ! اللہ کی بندگی کرو،

میں امتیاز نمایاں ہو جانے کا نقشہ پیش کرنا مقصود ہے۔ رسول کی آمد اور خدائی تعلیم و ہدایت کے نزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابرِ رحمت کے چھا جانے اور امرت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر بارش کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کے یکایک جی اُٹھنے اور اس کے بطن سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو اُس حالت کے لیے بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت کے یکایک جاگ اُٹھنے اور اس کے سینہ سے بھلائیوں کے خزانے اُبل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں، اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی صرف وہی انسان فائدہ اٹھاتے ہیں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسرِ کار آنے کا موقع نہیں ملتا۔ رہے شرارت پسند اور خبیث انسان تو جس طرح شور یلی زمین بارانِ رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اُگل دیتی ہے، اسی طرح رسالت کے ظہور سے انھیں بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خباثتیں اُبھر کر پوری طرح برسرِ کار آجاتی ہیں۔

اسی تمثیل کو بعد کے کئی رکوعوں میں مسلسل تاریخی شواہد پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں نبی کی بعثت کے بعد انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طیّب حصہ جو فیضِ رسالت سے پھلا اور پھولا اور بہتر برگ و بار لایا اور دوسرا خبیث حصہ جس نے کسوٹی کے سامنے آتے ہی اپنی ساری کھوٹ نمایاں کر کے رکھ دی اور آخر کار اس کو ٹھیک اسی طرح چھانٹ کر پھینک دیا گیا جس طرح سُنار چاندی سونے کے کھوٹ کو چھانٹ پھینکتا ہے۔

---

۴۷ یہاں سے تاریخی بیان کی ابتدا حضرت نوح اور ان کی قوم سے کی گئی ہے، کیونکہ قرآن کی رو سے جس صالح نظام زندگی

اُس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے[ف۱]۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"

حضرت آدم اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اُس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوح کے دور میں رونما ہوا اور اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور فرمایا۔

قرآن کے اشارات اور توراۃ کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح کی قوم اُس سرزمین میں باستی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثار قدیمہ میں تورات سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُن میں تقریباً اُسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور آرمینیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھیری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے آس پاس اور آرمینیہ کی سرحد پر کوہ ارارا ط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشان دہی کی جاتی ہے اور شہر نخچوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح نے ڈالی تھی۔

حضرت نوح کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرقِ الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انھوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

[ف۱] یہاں اور دوسرے مقامات پر حضرت نوح اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو خدا کے وجود کی منکر تھی، نہ خدا سے ناواقف تھی، نہ اسے خدا کی عبادت سے

اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو"۔ نوح نے کہا "اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمہارے رب کی یاددہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے[1]؟" مگر انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے

انکار تھا۔ بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی، شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو الوہیت میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں۔ جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا اور اس نے انسانوں میں اونچ اور نیچ کی تقسیم پیدا کر دی، اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ، کیونکہ اگر ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا بدکار اور نمک حرام ہی پیدا ہو گا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ہود رکوع ۳۔ سورۂ شعراء رکوع ۶۔ اور سورۂ نوح مکمل)

[1] یہ معاملہ جو حضرت نوح اور ان کی قوم کے درمیان پیش آیا تھا بعینہٖ ایسا ہی معاملہ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان بھی پیش آ رہا تھا۔ جو پیغام حضرت نوح کا تھا وہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ جو شبہات اہلِ مکہ کے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے، وہی شبہات ہزاروں

ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور اُن لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا[عله]

سال پہلے سردارانِ قوم نوح نے حضرت نوح کی رسالت میں ظاہر کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوح کہتے تھے بعینہٖ وہی باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتے تھے۔ آگے چل کر دوسرے انبیاء علیہم السلام، ان کی قوموں کے جو قصے مسلسل بیان ہو رہے ہیں ان میں بھی یہی دکھایا گیا ہے کہ ہر نبی کی قوم کا رویہ اہلِ مکہ کے رویہ سے اور ہر نبی کی تقریر محمد صلعم کی تقریر سے ہو بہو مشابہ ہے۔ اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ جس طرح گمراہی کی نوعیت ہر زمانے میں بنیادی طور پر ایک رہی ہے، اور جس طرح خدا کے بھیجے ہوئے معلموں کی دعوت ہر عہد اور ہر سرزمین میں یکساں رہی ہے، ٹھیک اسی طرح یقین رکھو کہ انبیاء کی دعوت سے منہ موڑنے اور گمراہی پر اصرار کیے چلے جانے کا جو انجام پہلے ہوتا رہا ہے، خدا کی اٹل سنت کے مطابق وہی انجام آج بھی ہوگا۔

[عله] جو لوگ قرآن کے اندازِ بیان سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے وہ بسا اوقات اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سارا معاملہ بس ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا ہو گا۔ نبی اٹھا اور اس نے اپنا دعویٰ پیش کیا، لوگوں نے اعتراضات کیے اور نبی نے ان کا جواب دیا، لوگوں نے جھٹلایا اور اللہ نے عذاب بھیج دیا۔ حالانکہ فی الحقیقت جن واقعات کو یہاں سمیٹ کر چند سطروں میں بیان کر دیا گیا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ مخصوص طرزِ بیان ہے کہ وہ قصہ گوئی محض قصہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے، اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصے کے صرف ان اہم اجزاء کو پیش کرتا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی قصہ کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف طور پر پیش کرتا ہے۔ مثلاً اسی قصۂ نوح کو لیجیے۔ یہاں اس کے بیان کا مقصد پیغمبر کی دعوت کو جھٹلانے کے انجام سے آگاہ کرنا ہے لہٰذا اس مقام پر یہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ پیغمبر کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتا رہا۔ لیکن جہاں یہ قصہ اس غرض کے لیے بیان ہوا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو صبر کی تلقین کی جائے وہاں خاص طور پر دعوتِ نوح علیہ السلام کی طویل مدت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ آں حضرت اور آپ کے رفقاء اپنی چند سال

(بقیہ حاشیہ) کی تبلیغی سعی و محنت کو نتیجہ خیز نہ پاکر بد دل نہ ہوں اور حضرت نوحؑ کے صبر کو دیکھیں جنھوں نے مدتہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوتِ حق کی خدمت انجام دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔

اس موقع پر ایک اور شک بھی لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ جب ایک شخص قرآن میں بار بار ایسے واقعات پڑھتا ہے کہ فلاں قوم نے نبی کو جھٹلایا اور نبی نے اسے عذاب کی خبر دی اور اچانک اس پر عذاب آیا اور قوم تباہ ہو گئی، تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں پیش آتے؟ اگرچہ قومیں گرتی بھی ہیں اور ابھرتی بھی ہیں، لیکن اس عروج و زوال کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ ایک نوٹس کے بعد زلزلہ یا طوفان یا صاعقہ آئے اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فنی تحقیق اخلاقی اور قانونی اعتبار سے اُس قوم کا معاملہ جو کسی نبی کی براہِ راست مخاطب ہو، دوسری تمام قوموں کے معاملات سے بالکل مختلف ہے۔ جس قوم میں نبی پیدا ہوا ہو اور وہ بلا واسطہ اس کو خود اسی کی زبان میں خدا کا پیغام پہنچائے اور اپنی شخصیت کے اندر اپنی صداقت کا زندہ نمونہ اس کے سامنے پیش کر دے، اس پر خدا کی حجت پوری ہو جاتی ہے، اُس کے لیے معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور خدا کے فرستادہ کو دو بدو جھٹلا دینے کے بعد وہ اس کی مستحق ہو جاتی ہے کہ اس کا فیصلہ برسرِ موقع چکا دیا جائے۔ یہ نوعیتِ معاملہ ان قوموں سے بنیادی طور پر مختلف ہے جن کے پاس خدا کا پیغام براہِ راست نہ آیا ہو بلکہ کسی مومن قوم کے واسطے سے پہنچا ہو۔ پس اگر اب اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے جیسے انبیاءؑ علیہم السلام کے زمانے میں پیش آئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ البتہ تعجب کے قابل کوئی بات ہو سکتی تھی تو یہ کہ اب بھی کسی قوم پر اسی شان کا عذاب آتا جیسا انبیاء کو دو بدو جھٹلانے والی قوموں پر آتا تھا۔

مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اب خدا سے برگشتہ اور فکری و اخلاقی گمراہیوں میں سرگشتہ قوموں پر عذاب آنے بند ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ایسی تمام قوموں پر عذاب آتے رہتے ہیں، چھوٹے چھوٹے تنبیہی عذاب بھی اور بڑے بڑے فیصلہ کن عذاب بھی، لیکن کوئی نہیں جو انبیاء علیہم السلام اور کتبِ آسمانی کی طرح ان عذابوں کے اخلاقی معنی

یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔

٦٥ اور عاد[1] کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے، پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟" اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے، جواب میں کہا "ہم تو تمہیں

کی طرف انسان کو توجہ دلائے، بلکہ اس کے برعکس ظاہر بیں سائنس دانوں اور حقیقت سے ناواقف مورخین و فلاسفہ کا ایک کثیر گروہ نوعِ انسانی پر مسلط ہے جو اس قسم کے تمام واقعات کی توجیہ طبیعاتی قوانین یا تاریخی اسباب سے کر کے اُس کو بھلاوے میں ڈالتا رہتا ہے اور اسے کبھی یہ سمجھنے کا موقع نہیں دیتا کہ اوپر کوئی خدا بھی موجود ہے جو غلط کار قوموں کو پہلے مختلف طریقوں سے ان کی غلط کاری پر متنبہ کرتا ہے اور جب وہ اس کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے آنکھیں بند کر کے اپنی غلط روی پر اصرار کیے چلی جاتی ہیں تو آخر کار انھیں تباہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

---

[1] یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی اور پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے، آثارِ قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں، جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے اُفتادہ پڑی ہوئی ہو اسے عادی الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں اس قوم کا ذکر بکثرت ملتا ہے اور عرب کے ماہرینِ انساب اپنے ملک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔

قرآن کی رو سے اس قوم کا اصل مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یمامہ کے درمیان واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل سے لے کر عراق تک اپنی طاقت کا سکہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حیثیت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں، لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنھیں عاد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ایک مقام پر حضرت ہود علیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریز بحری افسر

بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو"۔ اس نے کہا "اے برادرانِ قوم! میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمھیں متنبہ کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمھارے رب نے نوحؑ کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور تمھیں خوب تنومند کیا، پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو[۵۱]، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔ انھوں نے جواب دیا "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں[۵۲]؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے"۔ اس نے کہا "تمھارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں[۵۳]، اور جن کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے[۵۴]؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں

(James R. Wellested) کو حصن غراب میں ایک پرانا کتبہ ملا تھا جس میں ہود علیہ السلام کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تحریر ہے جو شریعتِ ہود کے پیرو تھے۔

---

[۵۱] یعنی اسے دونوں حیثیتوں سے یاد رکھو، اس حیثیت سے بھی کہ اس نے قوم نوح کو مٹانے کے بعد تمھیں اس کی جگہ سربلند کیا، اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ کل تمھیں مٹا کر کسی اور قوم کو تمھارا جانشین بنا سکتا ہے۔

[۵۲] یہاں یہ بات پھر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ قوم بھی اللہ سے منکر یا ناواقف نہ تھی اور نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ دراصل وہ حضرت ہود کی جس بات کو ماننے سے انکار کرتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اکیلے اللہ کی بندگی کی جائے، کسی دوسرے کی بندگی اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے۔

[۵۳] یعنی تم کسی کو بارش کا اور کسی کو ہوا کا اور کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ کسی کا نام تم نے مشکل کشا رکھ دیا ہے حالانکہ مشکل کشائی کی کوئی طاقت اس کے

بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"۔ آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور
ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔[۵۶] ع ۹

پاس نہیں۔ کسی کو تم گنج بخش کے نام سے پکارتے ہو حالانکہ اس کے پاس کوئی گنج ہی نہیں کہ کسی کو بخشے۔ کسی کے لیے تم داتا کا لفظ بولتے ہو، حالانکہ وہ کسی شے کا مالک نہیں کہ داتا بن سکے۔ کسی کو تم نے غریب نواز کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ اس اقتدار میں کوئی حصہ نہیں رکھتا جس کی بنا پر وہ کسی غریب کو نواز سکے۔ کسی کو تم غوث (فریاد رس) کہتے ہو حالانکہ وہ کوئی زور نہیں رکھتا کہ کسی کی فریاد کو پہنچ سکے۔ پس درحقیقت ایسے سب نام محض نام ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمیٰ نہیں ہے۔ جو ان کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے نہ کہ کسی حقیقت کے لیے۔

[۵۵] یعنی اللہ جس کو تم خود بھی رب اکبر تسلیم کرتے ہو، اس نے کوئی سند تمہارے ان بناوٹی خداؤں کی الٰہیت و ربوبیت کے حق میں عطا نہیں کی ہے، کہیں اس نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے فلاں فلاں کی طرف خدائی کا اتنا حصہ منتقل کر دیا ہے۔ کوئی پروانہ اس نے کسی کو مشکل کشائی یا گنج بخشی کا نہیں دیا۔ تم نے آپ ہی اپنے وہم و گمان سے اس کی خدائی کا جتنا حصہ جس کو چاہا ہے دے ڈالا ہے۔

---

[۵۶] جڑ کاٹ دی، یعنی ان کا استیصال کر دیا اور ان کا نام و نشان تک دنیا میں باقی نہ چھوڑا۔ یہ بات خود اہل عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے، اور موجودہ اثری اکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عادِ اولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں، چنانچہ مورخینِ عرب انہیں عرب کی اُمم بائدہ (معدوم اقوام) میں شمار کرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا جو حضرت ہود کا پیرو تھا۔ انہی بقایا عاد کا نام تاریخ میں عادِ ثانیہ ہے اور حِصنِ غُراب کا وہ کتبہ جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے انہی کی یادگاروں میں سے ہے۔ اس کتبہ میں (جسے تقریباً ۱۸ سو برس قبل مسیح کی تحریر سمجھا جاتا ہے) ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے چند جملے یہ ہیں:

"ہم نے ایک طویل زمانہ اس قلعہ میں اس شان سے گزارا ہے کہ ہماری زندگی تنگی و بدحالی سے دور تھی، ہماری نہریں دریا کے پانی سے بھرپور رہتی تھیں..

(بقیہ حاشیہ) ...... اور ہمارے حکمراں ایسے بادشاہ تھے جو بُرے خیالات سے پاک
اور اہلِ شر و فساد پر سخت تھے۔ وہ ہم پر ہود کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے
اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کر لیے جاتے تھے، اور ہم معجزات اور موت کے بعد
دوبارہ اُٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے"۔

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی قدیم عظمت و شوکت اور خوشحالی کے وارث آخر کار وہی لوگ ہوئے جو حضرت ہود پر ایمان لائے تھے۔

مقالات

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

(۲)

میں اپنی تلاش و تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اخلاق کے لیے صرف ایک ہی بنیاد صحیح ہے اور وہ اسلام فراہم کرتا ہے۔ یہاں فلسفۂ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کا جواب ہم کو ملتا ہے اور ایسا جواب ملتا ہے جس کے اندر وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جو فلسفیانہ جوابات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں مذہبی اخلاقیات کی اُن کمزوریوں میں سے بھی کوئی کمزوری موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے وہ نہ کسی مستحکم سیرت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ انسان کو تمدن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہمہ گیر اخلاقی رہنمائی ملتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کے انتہائی ممکن درجات تک ہمیں لے جا سکتی ہے۔ یہاں وہ اخلاقی اصول ہم کو ملتے ہیں جن پر ایک صالح ترین نظامِ تمدن قائم ہو سکتا ہے اور اگر ان اصولوں پر انفرادی و اجتماعی کردار کی بنا رکھی جائے تو انسانی زندگی اُس فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے جس سے وہ اِس وقت دوچار ہے۔ اس نتیجہ پر میں کن دلائل سے پہنچا ہوں؟ اِس کی مختصر تشریح میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

فلسفہ جس مقام سے اپنی اخلاقی بحث شروع کرتا ہے، درحقیقت وہ اخلاق کے مسئلے کا سرا نہیں ہے بلکہ بیچ کے چند نقطے ہیں جنھیں سرے کو چھوڑ کر اس نے نقطۂ آغاز بنا لیا ہے اور یہی اس کی پہلی غلطی ہے۔ یہ سوال کہ انسان کے لیے کردار کی صحت و غلطی کا معیار کیا ہے اور وہ کونسی بھلائی ہے جس کو پہنچنے کی سعی انسان کے لیے مقصود بالذات ہونی چاہیے، دراصل بعد کا سوال ہے، اس سے پہلے

جو سوال حل ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال اس لیے تمام سوالات پر مقدم ہے کہ حیثیت کے تعین کے بغیر اخلاق کا سوال محض بے معنی ہی نہیں ہوجاتا بلکہ اس میں بشبہ امکان اسی امر کا ہوتا ہے کہ اس طرح جو اخلاقیات متعین کیے جائیں گے وہ بنیادی طور پر غلط ہوں گے۔ مثلاً کسی جائیداد کے متعلق آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ اس میں کس طرح مجھے کام کرنا چاہیے اور کس قسم کے تصرفات میرے لیے حق ہیں اور کس قسم کے تصرفات باطل۔ کیا آپ اس سوال کو صحیح طور پر حل کر سکتے ہیں تا وقتیکہ پہلے اس بات کا تعین نہ کرلیں کہ اس جائیداد میں آپ کی حیثیت کیا ہے اور اس سے آپ کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ اگر یہ جائیداد کسی دوسرے کی ملک ہے اور آپ اس میں امین کی حیثیت رکھتے ہیں تو آپ کے لیے اس میں اخلاقی طرز عمل کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر آپ خود اس کے مالک ہیں اور اس پر آپ کے مالکانہ اختیارات غیر محدود ہیں تو آپ کے اخلاقی طرز عمل کی نوعیت بالکل دوسری ہو جائے گی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حیثیت کا سوال اخلاقی طرز عمل کی نوعیت کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے، بلکہ درحقیقت اسی پر اسی پر اس امر کے فیصلہ کا بھی انحصار ہے کہ اس جائداد میں آپ کے لیے صحیح طرز عمل متعین کرنے کا حق دار کون ہے، آپ خود یا وہ جس کے آپ امین ہیں۔

اسلام سب سے پہلے اسی سوال کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہمیں بالکل واضح طور پر ہر شائبۂ اشتباہ کے بغیر یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے۔ یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ سب خدا کی ملک ہیں، حتیٰ کہ انسان کا اپنا جسم اور وہ تمام قوتیں بھی جو اس جسم میں بھری ہوئی ہیں، انسان کی اپنی ملک نہیں ہیں بلکہ خدا کی ملک ہیں۔ خدا نے اس کو ان تمام چیزوں پر تصرف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے، اور اس ماموریت میں اس کا امتحان ہے۔ امتحان کا آخری نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکلے گا بلکہ جب افراد کا، قوموں کا اور پوری نوعِ انسانی کا کام ختم ہو چکے گا اور انسانوں کی ساعی کے اثرات و نتائج پایۂ تکمیل کو

پہنچ جائیں گے، تب خدا ایک ایک انسان سے حساب لے گا اور اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی بندگی اور نیابت کا حق ٹھیک ادا کیا ہے اور کس نے نہیں کیا۔ یہ امتحان کسی ایک امر میں نہیں بلکہ تمام امور میں ہے۔ کسی ایک شعبۂ زندگی میں نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری زندگی میں ہے۔ نفس، جسم کی جتنی قوتیں انسان کو دی گئی ہیں، سب کا امتحان ہے۔ اور خارج میں جن جن چیزوں پر جس جس طرح کے اختیارات اسے عطا کیے گئے ہیں، ان سب میں بھی امتحان ہے کہ وہ کس طرح ان پر اپنا اختیار استعمال کرتا ہے۔

حیثیت کے اس تعین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنے لیے اخلاقی طرزِ عمل کے تعین کا حق ہی سرے سے انسان کو حاصل نہیں رہتا بلکہ اس کا فیصلہ کرنا خدا کا حق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فلسفۂ اخلاق کے وہ تمام سوالات جن کو فلسفیوں نے چھیڑا ہے، نہ صرف یہ کہ حل ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ایک ایک سوال کے بیسیوں جوابات ہوں اور ایک ایک جواب انسانوں کا ایک ایک گروہ اخلاق کے ایک جداگانہ رخ پر چل پڑے اور ایک ہی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے یہ مختلف راستوں پر چلنے والے لوگ اپنی بے راہ رویوں سے بدنظمی، انتشار اور فساد برپا کریں۔ اگر انسان کی اُس حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے جو اسلام نے قرار دی ہے تو یہ بات خود متعین ہو جاتی ہے کہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہونا اور اس کی رضا کو پہنچنا ہی وہ بلند ترین بھلائی ہے جو مقصود بالذات ہونی چاہیے، اور کسی طرزِ عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار اسی امر پر ہے کہ وہ اس بھلائی کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی یہیں سے متعین ہو جاتی ہے کہ انسان کے لیے نیک و بد، صحیح اور غلط کے علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت ہے اور اس کے سوا دوسرے ذرائع علم اس اصل ماخذ کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل ماخذ نہیں بن سکتے۔ نیز یہ کہ قانونِ اخلاق کے لیے اصل امضار (Sanction) خدا کی ہے، اور یہ بھی کہ اچھے اخلاق کی پابندی اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک خدا کی محبت، اس کی

رضا کی طلب اور اس کی ناراضی کا خوف ہونا چاہیے۔

پھر نہ صرف یہ کہ اس سے فلسفۂ اخلاق کے سارے اصولی سوالات حل ہوجاتے ہیں بلکہ درحقیقت اس بنیاد پر جو اخلاقی سسٹم بنتا ہے اس کے اندر نہایت متوازن اور متناسب طریقے سے وہ تمام اخلاقی سسٹم اپنی اپنی موزوں جگہ پا لیتے ہیں جو فلسفۂ اخلاق کے مفکرین نے تجویز کیے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاقی نظاموں کی اصل قباحت یہ نہیں ہے کہ ان میں حقیقت و صداقت کا کوئی جز ہی نہیں ہے، بلکہ ان کی اصلی قباحت یہ ہے کہ انھوں نے صداقت کے ایک جز کو لے کر پوری صداقت بنا لیا ہے اس لیے جز کے کل بننے میں جس قدرِ زائد کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکمیل کے لیے لامحالہ انھیں باطل کے بہت سے اجزا لینے پڑتے ہیں۔ اسلام اس کے برعکس پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل صداقت میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہوجاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ تھیں اور ناقص تھیں۔ یہاں خوشی کا بھی ایک مقام ہے، مگر اس سے مراد وہ خوشی و خوش حالی ہے جو خدا کے قانون کی پیروی سے اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہو، اور یہ خوشی و خوش حالی جسمانی و مادی بھی ہے، ذہنی و نفسی بھی، آرٹسٹک اور روحانی بھی۔ نیز یہ خوشی و خوش حالی فرد کی بھی ہے، جماعت کی بھی، اور تمام انسانیت کی بھی۔ ان مختلف خوشیوں میں تصادم نہیں بلکہ توافق ہے۔ یہاں کمال کا بھی ایک مقام ہے، مگر وہ کمال جو خدا کے امتحان میں سو فی صدی نمبر پانے کا مستحق ہو۔ اور یہ فرد کا، جماعت کا، قوم کا، پوری انسانیت کا، غرض سب ہی کا کمال ہے۔ صحیح اخلاقی طرزِ عمل وہ ہے جس سے ہر فرد نہ صرف خود کمال کی طرف ترقی کرے بلکہ دوسروں کی تکمیل میں بھی مددگار ہو اور کوئی کسی کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو۔ یہاں کانٹ کے "قطعی واجب الاطاعت" (Categorical imiperative) کو بھی پوری عزت کی جگہ مل جاتی ہے، اور اس جہاز کو وہ لنگر بھی مل جاتا ہے جس کے بغیر یہ فلسفہ کے دریا میں ڈگمگا رہا تھا۔ جس قطعی واجب الاطاعت قانون کا ذکر کانٹ نے کیا ہے اور جس کی وہ خود کوئی توضیح نہ کر سکا، دراصل وہ خدا کا قانون ہے۔ خدا ہی کی طرف سے اس کی صورت معین کی گئی ہے، خدا ہی کی

قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے، اور اسی کی بے چون و چرا اطاعت کا نام نیکی ہے۔

اسی طرح یہاں اخلاقی خیر و شر کے علم کا جو ماخذ ہمیں بتایا گیا ہے وہ اُن دوسرے ذرائع علم کی نفی نہیں کرتا جن کی طرف فلاسفہ رجوع کرتے ہیں بلکہ ان سب کو ایک سسٹم کا جزء بنا لیتا ہے۔ البتہ وہ نفی جس چیز کی کرتا ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ انھیں یا ان میں سے کسی ایک کو اصلی اور آخری ذریعۂ علم کی حیثیت سے لیا جائے۔ خدا کی ہدایت کے ذریعہ سے خیر و شر کا جو علم ہمیں بخشا گیا ہے وہ اصل علم ہے؛ اور تجربی علم، قوانینِ حیات اور حالاتِ موجودہ سے استنباط کیا ہوا علم، عقلی علم، اور وجدانی علم، یہ سب اُس کے شواہد ہیں۔ جن چیزوں کو خدا کی ہدایت خیر کہتی ہے، انسانیت کا تجربہ ان کے خیر ہونے پر شہادت دیتا ہے، قوانینِ حیات اس کی تصدیق کرتے ہیں، عقل اور وجدان دونوں اس پر گواہ ہیں۔

لیکن معیارِ صداقت خدائی ہدایت ہے نہ کہ یہ ذرائع علم۔ انسانیت کے تاریخی تجربات سے، یا قوانینِ حیات سے اگر کوئی ایسا استنباط کیا جائے یا عقل اور وجدان سے کوئی ایسی رائے قائم کی جائے جو خدا کی ہدایت کے خلاف ہو تو اصل اعتبار خدا کی ہدایت کا کیا جائے گا نہ کہ اُس استنباط یا اُس رائے کا۔ ہمارے پاس علم کا ایک مستند معیار ہونے کا فائدہ ہی یہ ہے کہ ہمارے علوم میں ڈسپلن پیدا ہو اور ہم اس انارکی اور بدنظمی سے بچ جائیں جو کسی معیار کے نہ ہونے اور اعجابُ کل ذی رأیٍ برأیہٖ سے پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح یہاں قانونِ اخلاق کی پشتیبان قوت Sanction اور محرکات کا مسئلہ بھی اس طور پر حل ہوتا ہے کہ اس سے ان دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو فلسفیوں نے تجویز کی ہیں بلکہ صرف ان کی تصحیح ہو جاتی ہے اور جن غلط حدود پر وہ پھیلا دی گئی ہیں یا خود پھیل جاتی ہیں وہاں سے ان کو ہٹا کر ایک جامع سسٹم میں ٹھیک مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ خدا کا قانون اس لیے کہ وہ خدا کا قانون ہے اپنے قیام کی طاقت آپ اپنے اندر رکھتا ہے، اور یہ طاقت اس مومن کے نفس میں بھی موجود ہے جو خدا کی رضا چاہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور خود اُس کمال کا طالب ہے

جو خدا کی طرف بڑھنے سے حاصل ہو، نیز یہ طاقت مومنین کی سوسائٹی اور اس صالح ریاست میں بھی موجود ہے جو خدا کے قانون پر مبنی ہو۔ قانون کی پابندی پر مومن کو آمادہ کرنے والی چیز اس کی خالص فرض شناسی بھی ہے، اُس کا حق کو حق جانتے ہوئے اسے پسند کرنا اور باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنا بھی ہے، اور وہ طمع اور خوف بھی ہے جو وہ اپنے خدا سے رکھتا ہے۔

دیکھیے، اس طرح اسلام اُس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لیے ایک نظامِ اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے چلیے۔ اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا واحد مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اِس خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز دعائے خیر کے کسی ایسی سفارش کی گنجائش بھی نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور رد نہ کی جا سکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کامیابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرزِ عمل پر ہے، نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے، نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے، اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانبداری نہیں ایسی کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں، سب کے لیے ایک ہی قانونِ اخلاق ہے، اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود غفور ہے اور درگزر کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے، تنگ نظری و تنگ دلی سے، بے رحمی و سنگ دلی سے، تعصب اور نفسانی جانب داری سے پاک ہے اس لیے انہی کو پسند کرتا ہے جو ان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تنہا اسی کا حق ہے اس لیے تکبر اسے ناپسند ہے۔ خدائی صرف اس کے لیے ہے اور دوسرے اس کے بندے ہیں، اس لیے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ اکیلا ہے اور دوسرے کی

پاس جو کچھ ہے امانت کی حیثیت سے ہے، اس لیے کسی بندے کی خود مختاری، اور کسی کا کسی کے لیے قانون بنانا، اور کسی کا کسی کے لیے بذاتِ خود واجب الاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔ سب کا مطاع وہی ایک ہے اور سب کے لیے خیر اسی میں ہے کہ اس کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ پھر وہ محسن ہے اور شکر، احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے۔ وہ منعم ہے اور اس کا حق دار ہے کہ اس کی نعمتوں میں اسی کے منشا کے مطابق تصرف کیا جائے۔ وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم وخبیر ہے اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے اس لیے ظاہری حُسنِ اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ وہ محیط ہے اس لیے کوئی یہ امید بھی نہیں کر سکتا کہ جرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔

خدا کے اس تصور پر غور کیجیے، اس سے خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے ایک مکمل اخلاقی زندگی کا نقشہ وجود میں آتا ہے اور وہ نقشہ ان تمام کمزوریوں سے خالی ہے جو مشرکانہ مذاہب کے اخلاقیات اور دہریانہ مسلکوں کے اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں یہاں نہ تو اخلاقی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کے لیے چور دروازے کہیں موجود ہیں، نہ ان ظالمانہ فلسفوں کے لیے کوئی جگہ ہے جن کی بنا پر انسان اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے عالمِ انسانیت کو تقسیم کر کے ایک حصہ کے لیے مجسم فرشتہ اور دوسرے حصہ کے لیے مجسم شیطان بن جاتا ہے۔ نہ دہری اخلاقیات کی وہ بنیادی کمزوریاں اس میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اخلاق میں کوئی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان سلبی خوبیوں کے ساتھ اس نقشہ میں یہ ایجابی خوبی موجود ہے کہ یہ اخلاقی فضیلت کا ایک بلند ترین اور وسیع ترین منتہا پیش کرتا ہے جس کی وسعت اور بلندی کی کوئی حد نہیں، اور اس منتہا کی طرف بڑھنے کے لیے ایسے محرکات فراہم کرتا ہے جو پاکیزہ ترین ہیں۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو

دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام حیثیتوں میں ہے جو انسانوں کو یہاں حاصل ہیں، اور کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے، یہ اخلاق کے دائرے کو اُتنا ہی پھیلا دیتا ہے جتنا امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ انسان کی عقل، اس کے ذرائع علم، اس کی ذہنی و فکری قوتیں، اس کے حواس، اس کے جذبات، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں، سب کی سب امتحان میں شریک ہیں، یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے۔ پھر خارج کی دنیا میں جن جن اشیاء سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے، جن اشیاء پر وہ تصرف کرتا ہے، جن انسانوں سے مختلف طور پر اس کو واسطہ پڑتا ہے، ان سب کے ساتھ اس کے برتاؤ میں امتحان ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں امتحان ہے کہ انسان یہ سب کچھ خدا کی خداوندی اور اپنی عبدیت و نیابت کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے یا آزادی و خود مختاری کی ہوا میں مبتلا ہو کر؟ یا خدا کے سوا دوسروں کا بندہ بن کر؟ اس وسیع ترین تصورِ اخلاق میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے، اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اُس امتحان میں کامیاب ہو سکے جو ایک ایک میدانِ زندگی سے متعلق ہے۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کا اصلی اور آخری فیصلہ اس زندگی میں نہیں بلکہ دوسری زندگی میں ہوگا اور حقیقی کامیابی و ناکامی وہ ہے جو وہاں ہو نہ کہ یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر (Out look) کو بنیادی طور پر بدل دیتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے وہ نتائج جو اس دنیا میں نکلتے ہیں ہمارے لیے حسن و قبح، صحت اور غلطی، حق اور باطل، اور کامیابی و ناکامی کے قطعی، اصلی اور آخری معیار نہیں رہتے، اس لیے قانونِ اخلاق کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بھی ان نتائج پر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس تصور کو قبول کرے گا وہ قانونِ اخلاق کی پیروی پر بہر حال

ثابت قدم رہے گا خواہ اس دنیا میں اس کا نتیجہ بظاہر اچھا ہو یا برا، کامیابی کی صورت میں نکلتا نظر آئے یا ناکامی کی صورت میں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی نگاہ میں دنیوی نتائج بالکل ہی ناقابلِ لحاظ ہوں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اصلی اور آخری لحاظ ان کا نہیں بلکہ آخرت کے پائدار نتائج کا کرے گا اور اپنے لیے صحیح صرف اُس طرزِ عمل کو سمجھے گا جو ان نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے وہ کسی چیز کو چھوڑنے اور کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کرے گا کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں وہ لذت اور خوشی اور نفع کی موجب ہے یا نہیں بلکہ اس بنیاد پر کرے گا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں اپنے قطعی و حتمی نتائج کے اعتبار سے وہ کیسی ہے۔ اس طرح اس کا نظامِ اخلاق ترقی پذیر تو ضرور رہے گا مگر اس کے اصولِ اخلاق تغیر پذیر نہ ہوں گے اور نہ اس کی سیرت ہی تلون پذیر ہو گی۔ یعنی تمدن و تہذیب کے نشوونما کے ساتھ ساتھ اُس کے اخلاقی تصورات میں وسعت تو یقیناً ہو گی مگر یہ ممکن نہ ہو گا کہ واقعات کی ہر کروٹ اور حالات کی ہر گردش کے ساتھ اخلاق کے اصول بھی بدلتے چلے جائیں اور آدمی ایک اخلاقی گرگٹ بن کر رہ جائے کہ اس کے اخلاقی رویہ میں سرے سے کوئی پائداری ہی نہ ہو۔

پس اخلاق کے نقطۂ نظر سے آخرت کا یہ اسلامی تصور دو اہم فائدے عطا کرتا ہے جو کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس سے اصولِ اخلاق کو غایت درجہ کا استحکام نصیب ہوتا ہے جس میں تزلزل کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی اخلاقی سیرت کو وہ استقامت میسر آتی ہے جس میں (بشرطِ ایمان) انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دنیا میں سچائی کے دس مختلف نتیجے نکل سکتے ہیں اور ان نتائج پر نگاہ رکھنے والا ایک ابن الوقت انسان مواقع اور امکانات کے لحاظ سے دس مختلف طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے، لیکن آخرت میں سچائی کا نتیجہ لازماً ایک ہی ہے اور اس پر نظر رکھنے والا ایک مومن انسان دنیوی فائدے اور نقصان کا لحاظ کیے بغیر لازماً ایک ہی طرزِ عمل اختیار کرے گا۔ دنیوی نتائج کا اعتبار کیجیے تو خیر و شر کسی متعین چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک ہی چیز اپنے مختلف نتیجوں کے لحاظ سے

کبھی خیر اور کبھی شر بنتی رہتی ہے اور اس کے اتباع میں دنیا پرست آدمی کا کردار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے، لیکن آخرت کے نتائج پر نظر رکھیے تو خیر اور شر دونوں قطعی طور پر متعین ہو جاتے ہیں اور مومن بالآخرۃ آدمی کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کبھی خیر کو بد انجام یا شر کو نیک انجام سمجھ کر اپنے کردار کو بدل دے۔

پھر یہ تصور کہ انسان اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے اور تصرف کے جو اختیارات یہاں اُسے حاصل ہیں وہ سب دراصل نائب خدا ہونے کی حیثیت سے ہیں، انسانی زندگی کے لیے راستے اور مقصد دونوں کا تعین کر دیتا ہے۔ اس تصور سے لازم آتا ہے کہ انسان کے لیے خود مختاری اور بندگی غیر اور خداوندانہ بڑائی کے تمام رویّے غلط ہوں اور صرف یہی ایک رویہ صحیح ہو کہ اپنے تمام تصرفات میں وہ خدا کی مرضی کا تابع اور اس کے نازل کردہ اخلاقی قانون (Moral law) کا پابند بن کر رہے۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان ایک طرف تو اپنے اخلاقی رویّہ میں ہر ایسے طرزِ عمل سے بشدت اجتناب کرے جس میں خود مختاری و بغاوت کا، یا خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا، یا خداوندانہ کبریائی کا ذرہ برابر شائبہ پایا جاتا ہو، کیونکہ یہ تینوں چیزیں اس کی نائبانہ حیثیت کے منافی ہیں، مگر دوسری طرف خدا کی املاک میں اس کا تصرف اور خدا کی پیدا کردہ قوتوں میں اس کا برتاؤ، اور خدا کی رعیت میں اس کی فرماں روائی اُس اخلاق اور اُس برتاؤ کے عین مطابق ہو جو اس سلطنت کا اصل مالک اپنے ملک اور اپنی رعیت میں اختیار کر رہا ہے، کیونکہ نائبانہ حیثیت کا فطری اقتضا یہی ہے کہ نائب سلطان کی پالیسی خود سلطان کی پالیسی سے اور نائب سلطان کے اخلاق خود سلطان کے اخلاق سے منافی نہ ہوں۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو قوتیں اللہ نے انسان کو عطا کی ہیں اور جو ذرائع اور وسائل اسے دنیا میں بخشے ہیں ان سب کو استعمال کرنے اور منشاء الٰہی کے مطابق استعمال کرنے پر انسان مامور ہو۔ ایسی دوسرے الفاظ میں وہ نائب سلطان بھی سخت مجرم ہو جس نے

سلطان کے منشار کے خلاف اُس کی ملک اور اس کی رعیت میں تصرف کیا، اور اسی طرح وہ نائب بھی بڑا مجرم قرار پائے جس نے سلطان کے دیے ہوئے اختیارات میں سے کسی اختیار کو سرے سے استعمال ہی نہ کیا، اس کی بخشی ہوئی قوتوں میں سے کسی قوت کو بلا وجہ ضائع کیا، اس کے دیے ہوئے ذرائع و وسائل سے کام لینے میں جان بوجھ کر کوتاہی کی، اور اس ڈیوٹی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا جس پر سلطان نے اسے مامور کیا تھا۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ پوری نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی ایسے ڈھنگ پر قائم ہو کہ سارے انسان، یعنی خدا کے سب خلیفہ اُن ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں، جو خدا نے اُن پر عائد کی ہیں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور نظام تمدن و عمران میں ایسی کوئی چیز کارفرما نہ ہو جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی، یا انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی خلافت کو عملاً سلب کرلے یا اس کے اجراء میں مانع و مزاحم ہو، بجز اُس صورت کے جبکہ کوئی انسان یا گروہِ انسانی خلافت سے منحرف ہو کر اپنے حقیقی سلطان سے بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہو۔

یہ تو ہے وہ اخلاقی منہاج جو تصورِ خلافت سے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے متعین ہے۔ رہا انسان کی اخلاقی زندگی کا مقصد اور اس کی تمام سعی و عمل کا نصب العین، تو وہ بھی اسی تصور سے بالکل ایک منطقی تروم کے ساتھ متعین ہوتا ہے۔ نائب سلطان کی حیثیت سے انسان کا زمین پر مامور ہونا خود بخود اس بات کا مقتضی ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا نے زمین کے انتظام کا جتنا حصہ انسان سے متعلق کیا ہے اس حصہ میں خدا کے قانون کو جاری کرنا، خدا کے منشار کے مطابق امن اور عدل اور صلاح کا نظام قائم کرنا اور قائم رکھنا، اس نظام میں شر و فساد کی جو جو صورتیں شیاطین جن و انس پیدا کریں ان کو دبانا اور مٹانا، اور اُن بھلائیوں کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما دینا جو خدا کو محبوب ہیں اور جن سے خداوند عالم اپنی زمین اور اپنی رعیت کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہے وہ مقصد جس پر ہر وہ انسان اپنی تمام مساعی کو مرکوز کر دے گا جس کے

اندر خلیفۂ الٰہی ہونے کا شعور بیدار ہو چکا ہو۔ یہ مقصد صرف یہی نہیں کہ ان تمام مقاصد کی نفی کر دیتا ہے جو لذت پرستوں اور مادہ پرستوں اور قوم پرستوں اور دوسرے جہلات کے پرستاروں نے اپنی زندگی کے لیے مقرر کیے ہیں، بلکہ یہ اُن لایعنی مقاصد کی بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے جو روحانیت کے ایک غلط تصور کے تحت اہلِ مذاہب نے متعین کیے ہیں۔ ان دونوں غلط انتہاؤں کے درمیان خلافت الٰہیہ کا تصور انسان کے سامنے ایک ایسا بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصدِ حیات رکھ دیتا ہے جو اُس کی ساری قوتوں اور قابلیتوں کو زندگی کے ہر میدان میں برسرِ کار لاتا ہے اور انھیں ایک صالح ترین نظامِ تہذیب و تمدن کے قیام و ارتقاء کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جو اخلاقِ انسانی کی تعمیر کے لیے اسلام نے ہم کو دی ہیں۔ اسلام کسی ایک قوم کی جائداد نہیں بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے اور سارے انسانوں کی فلاح اس کے پیشِ نظر ہے اس لیے ہر اُس شخص کو جو اپنی اور انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہو، یہ سوچنا چاہیے کہ آیا انسانی اخلاق کی تعمیر کے لیے یہ بنیادیں بہتر ہیں جو اسلام ہمیں دے رہا ہے یا وہ جو روحانی مذاہب یا فلسفیانہ مسالک ہم کو دیتے ہیں؟ اگر کسی کا دل گواہی دے کہ اخلاق کے لیے یہی بنیادیں صحیح تر ہیں تو پھر کوئی جاہلانہ تعصب ؟ سے ان بنیادوں کے قبول کر لینے میں مانع نہ ہونا چاہیے۔

اطلاع

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی جملہ تصانیف "سلیمان بُک ڈپو۔ صدر بازار، کپور تھلہ" سے بھی مل سکتی ہیں

شرک کا اصلی سبب

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

پچھلے مقالہ میں یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر ایک منعم حقیقی کی محبت اور اس کے حمد و شکر کا جذبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور ہر ابن آدم نے "بلیٰ" کہہ کر اس عہد و اقرار میں شرکت کی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى، شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (۱۷۲ - اعراف)

اور یاد کرو جب لیا تمھارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا ان کے اوپر کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں، بولے ہاں ہم گواہ ہیں۔ یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے۔ ہمیں تو نہ اس "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کی کوئی خبر ہے، نہ اس "بَلٰى" کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں، بالخصوص جبکہ اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ قیامت کے دن بہرشکل یہ عہد ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔ لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر، ۹ مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت وخون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر، ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے

جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جاں کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کے غور و پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اُس سے زیادہ بچہ کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اُٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے۔ تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایک ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلّم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری بر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلّم ہے۔ یہ استحقاق (Privilege) اور ذمہ داری (Responsibility) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔

اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر، آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہری میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہو جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت اور آزادی اور جان و مال میں اس کو شریک کریں اور

اگر سلطنت کا وجود کسی خطرے میں پڑ جائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔ اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق ادا کرنے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے متمتع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبے کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا۔ تو کیا اس کا یہ جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی یہ عذر غلط ہے جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاق غلیظ کیا ہے اور زبانِ خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی۔ اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی کیونکہ ہر استحقاق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی، ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں لگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں اگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت ہی لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا

انکار کر دیں۔ ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں خود بخود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔

اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدہ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان و قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں، گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدہ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے اور گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے ساز گار اور نفع رساں بنایا![1]

---

[1] یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ گیتا میں اس شخص کی مثال چور سے دی گئی ہے جو خدا کی نعمتوں سے خانہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کے لیے قربانی نہیں کرتا

پس یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ انسان کو اس قسم کے کسی عہد کا علم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس عہد سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبت اور طلب کا جذبہ دے کر اس کی راہ میں خوف اور طمع، رغبت اور رہبت کے بہت سے عقبات ڈال دیے ہیں تاکہ اس کے اختیار و آزادی کا امتحان ہو اور ہر شخص اپنی ہمت و قابلیت کے اعتبار سے خدا کے ہاں درجہ اور عزت حاصل کر سکے۔ یہی عقبات ہیں جو طالب صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں۔ جو عالی ہمت ہیں وہ تو ہر پست و بلند اور سہل و صعب کو طے کرتے ہوئے خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ نہ راہ کے کسی خطرے کی پروا کرتے ہیں نہ کسی طمع کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی فطرت کی صدائے جرس سنتے ہیں اور اس کی کشش انھیں اتنی مہلت بھی نہیں دیتی کہ وہ تلوے کے آبلوں اور کانٹوں کی جلن اور چبھن کا خیال کر سکیں۔ لیکن جو پست ہمت اور بلید ہوتے ہیں وہ ان عقبات میں سے کسی عقبہ کے پاس ہمت ہار کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی دنائت ہے جو در اصل غیر اللہ کی بندگی کا اصل سبب ہے اور یہ سبب عدمی ہے یعنی انسان اپنے درجے اور علوئے منصب کا خیال نہیں کرتا اور جہاں کوئی گھنی چھاؤں یا کوئی خطرہ دیکھتا ہے وہیں کمر کھول کے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دنائت جن گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے ان کی تفصیل بہت طویل ہو گی۔ ہم ذہن میں اس کا تصور پیدا کرنے کے لیے صرف اجمالی تذکرہ پر کفایت کریں گے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات کے اندر ایک چھوٹی سی بادشاہی بخشی ہے۔ اس کے وجود کی تقویم اس طرح فرمائی کہ اس کو بہترین قابلیتوں اور بہترین قوتوں سے آراستہ کیا۔ اس کو کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، بیوی بچے، گھر گرستی کی خواہشیں دیں تاکہ ان خواہشوں کی تحریک سے وہ اپنی بقائے ذات و بقائے نوع کی قابلیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اس کو عقل عنایت فرمائی جو خیر و شر میں امتیاز کرنے والی ہے۔ دل عنایت فرمایا جو بلند ارادوں کا مخزن ہے۔ روح عنایت فرمائی جس میں اپنی طلب اور جستجو ودیعت کی اور ان سب پر اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان سب پر حکومت کرے اور ان کو اپنے رب کی رضا کی راہ

میں استعمال کر کے خدا کے یہاں بلند سے بلند مرتبہ حاصل کرے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کو جتنی چیزیں ملی ہیں ان میں خواہشیں سب سے زیادہ لذیذ ہیں۔ ان کی لذت نقد اور ان کا نفع عاجل ہے۔ پس وہ ان کا اس درجہ گرویدہ ہوا کہ اس نے اپنی ساری سلطنت ان کے حوالے کر دی۔ اس نے اپنے حواس خمسہ کو حکم دے دیا کہ وہ خواہشوں کی اطاعت کریں اور جو کچھ انھیں مطلوب ہے صرف اس کی تلاش میں اپنے آپ کو سرگرم رکھیں۔ اس نے عقل کی عدالت معطل کر دی تاکہ ان خواہشوں کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو سکے۔ اس نے دل کو بھی ان خواہشوں ہی کے تصرف میں دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بس وہ بطن و فرج کا بندہ بن کے رہ گیا۔ اس کی مثال اس بادشاہ کی ہو گئی جو اپنی کسی لونڈی پر اس درجہ فریفتہ ہو جائے کہ اپنے آپ کو اور اپنی پوری مملکت کو اس کے امر و نہی کے حوالے کر دے اور اس کی سلطنت کے تمام شرفاء و علماء اور مدبرینِ ملک و اعضائے سلطنت اس لونڈی کے غلام بن کر رہ جائیں۔ یہ اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوَاهُ کی صورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ انسان کی فطرت نہیں بلکہ اس کی دناءت کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماں باپ بنائے، بیوی بچے بخشے، خویش و اقارب دیے، کنبہ و خاندان اور قبیلہ و قوم کی جمعیت بخشی، مال و جائداد عنایت فرمائی، جانوروں کے گلے دیے، تاکہ انسان ان کے اندر اور ان کے ذریعہ سے اپنی ان مدنی و اجتماعی قابلیتوں کو بروئے کار لائے جو اس کے اندر ودیعت ہیں اور اس مدنیت فاضلہ کی تخلیق کرے جس کا وہ خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے اہل ہے لیکن انسان نے ان سارے وسائل مقصد کو اصل مقصد بنا لیا۔ وہ باپ ماں کی محبت میں ایسا مستغرق ہوا کہ اس نے پدر پرستی کی بنیاد ڈال دی، بیوی بچوں کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ خدا اور اس کے حکموں کو بھول گیا، کنبہ و خاندان و قبیلہ و قوم کی عصبیت میں ایسا پھنسا کہ ان کے لیے خدا اور اس کے رسولوں سے بغاوت کی۔ یہاں تک کہ اس محبت کے غلو میں اس نے آباء پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ وہ مال و جائداد کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ انہی کو معبود خیال کرنے لگا۔ حد یہ ہے کہ جن جانوروں کو اس نے نافع پایا ان کو بھی اس نے دیوتا بنا لیا۔ گائے، بیل،

ہاتھی گھوڑے وغیرہ سب اسی طرح دیوتا بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بطور مرکب اسے عنایت کیں ان کو اس نے راکب بنالیا اور جو چیزیں بطور کمند کے دیں کہ ان کے سہارے سے خدا تک پہنچ سکے ان کمندوں کو اس نے اپنے پاؤں اور گردن میں پھندا بنا کر ڈال لیا۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں ایسی بخشی ہیں جو انسان کے لیے یکسر نفع ہی نفع تھیں۔ اپنی نفع رسانیوں کے عوض میں، بیوی بچوں، قوم و قبیلہ اور گائے گھوڑے کی طرح آدمی سے کسی حق اور ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے، قوس قزح، ابر، ہوا، آگ، پانی، زمین، دریا، پہاڑ، فضا کی چڑیاں وغیرہ۔ یہ اس لیے کہ انسان اُن کے وجود سے متمتع ہو اور ان کے حقوق کی ذمہ داریوں سے بالکل بے فکر رہ کر اپنے اوقات صرف رضائے مولیٰ کے کاموں میں مشغول رکھ سکے لیکن انسان نے جب دیکھا کہ اتنے نافع ہونے کے باوجود یہ اس سے کسی عوض کے طلبگار نہیں ہیں تو ان کی اس صفت کی فیض رسانی پر ایسا ریجھا کہ ان میں سے ہر نعمت کو اس نے منعم کا درجہ دے کر اس کی عبادت شروع کر دی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی مقرب خاص کو بہت سے غلام اور لونڈیاں عنایت کرے اور ان کی ساری ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے لے تاکہ وہ مقرب خاص اپنی اور اپنے خدام کی ساری ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش رہ کر اپنی ساری توجہ صرف سلطنت کے امور مہمہ پر صرف کر سکے لیکن وہ مقرب خاص ان غلاموں اور لونڈیوں کی اس بے مزد و صلہ خدمات پر اس طرح ریجھ جائے کہ ان ہی کو بادشاہ تصور کر کے ان ہی کی بندگی اور اطاعت کرنے لگ جائے اور بادشاہ اور اس کی سلطنت کو بالکل بھول جائے۔

اسی طرح بہتوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بارش کی۔ ان کو ملک و مال دیا، عزت و رتبہ بخشا، تخت و تاج عنایت کیا تاکہ ان کو آزمائے کہ وہ اس کی بندگی کرتے ہیں یا اس سے بغاوت، زمین پر اس کا قانون چلاتے ہیں یا اپنا، عدل و امن پھیلاتے ہیں یا ظلم و فساد۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ سب کچھ ان کے استحقاق و قابلیت کا ثمرہ ہے، تکبر کیا اور بندگی کی جگہ خدائی شروع کر دی۔ کوئی یہ سمجھ بیٹھا کہ ہم خدا کے اوتار ہیں جیسے مصر کے

اوتار بادشاہ (God Kings) اور ہندوستان کے قدیم سلاطین۔ اکبر کو بھی اس کے جاہل اور خوشامدی درباریوں نے اسی قسم کے خبط میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی اپنے تئیں آسمانی مخلوق خیال کرنے لگا مثلاً چین وغیرہ کے بادشاہ۔ مصر میں پہنچ کر سکندر بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گیا اور اپنا ملک، اپنا قانون، اپنا فرمان، یہ تو ان ملوک و سلاطین کی ایک عام بیماری ہمیشہ سے رہی ہے جس سے بہت ہی کم خوش قسمت بچ سکے۔ ان طاغوتوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو کچھ خدم و حشم دے کر اپنی مملکت کے کسی علاقہ میں انتظام پر مامور کرے اور وہ غلام خدم و حشم پا کر ایسا بدمست ہو کہ وہاں پہنچ کر اپنی بادشاہی کا علم گاڑ دے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہتوں کو اس طرح کی ذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا اور یہ بھی اس کی ایک بہت بڑی نعمت تھی اور مقصود اس سے انسان کے صبر و رضا کا امتحان تھا کہ دیکھے کہ لوگ طمع دنیا میں پھنس کر خدا کے ان باغیوں ہی کو معبود بنا لیتے ہیں یا اپنے خشک نوالوں پر قانع رہ کر اپنی فطرت کے عہد پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بہتیرے اس امتحان میں پورے نہیں اترے اور خدا کی جگہ اس کے باغیوں ہی کے تقرب کے طالب ہوئے اور ان کے لیے تذلل اور تعبد کی وہ ساری رسمیں بجا لائے جو رب کائنات کے سوا کسی کے لیے بھی موزوں نہیں ہو سکتیں۔ ان ہی لوگوں نے خدا کے ان باغیوں کو ان کی زندگی میں خداوند نعمت، ان داتا وغیرہ بنایا اور مرنے کے بعد ان کے مقبرے، اسٹیچو اور بُت تعمیر کرائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں پر روحانی برکتیں نازل کیں۔ بعض کو اپنا سفیر و پیغمبر بنایا۔ اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں نے کبھی غیر اللہ کی بندگی کی دعوت نہیں دی لیکن کچھ زمانہ گذرنے کے بعد ان کے دنیا طلب مریدوں اور ان کی محبت کے جھوٹے مدعیوں نے بشتر اپنے دنیاوی اغراض کے لیے ان کو لے جا کر خدا کی صف میں بٹھا دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور بہت سے اولیاء و مشائخ اس طرح خدا کے شریک بنا دیے گئے۔

اسی طرح سیاسی و معاشرتی اغراض دنیہ بھی اکثر شرک و بت پرستی کے باعث ہوئے۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قوموں نے دوسری قوموں کے بُت، محض ان کے ساتھ سیاسی تعلقات

استوار رکھنے کے لیے پوجے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کی دلجوئی کے لیے ان کے بتوں کو اپنے معبدوں میں جگہ دی۔ ہندوستان میں اکبر نے اسی مقصد سے بہت سی خفیف الحرکتیاں کیں۔ قریش نے خانہ کعبہ کو تمام قبائل عرب کے بتوں کا معبدِ اعظم بنا دیا تاکہ اس طرح تمام قبائل عرب پر اپنی سیادت قائم رکھ سکیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی بارہا اس قسم کے رذیل مقاصد کے لیے پڑوس کی مشرک قوموں کے بُت پوجے۔ اور یہ تو ان کی تاریخ کی ایک عام حکایت ہے کہ انھوں نے مشرک قوموں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان کے ساتھ ان کے اصنام اور ان کے مشرکانہ عقائد و رسوم بھی اپنے گھروں میں لائے اور پھر ان سے جو اولادیں پیدا ہوئیں وہ بھی لازماً شرک پر اٹھیں۔ مسلمانوں پر انگریزوں اور مغربی قوموں کے غلبہ اور ہندوؤں کے ساتھ اشتراک ارتباط کی وجہ سے جو اثرات پڑے، پڑ رہے ہیں (اور اگر حالات نہ بدلے تو) پڑیں گے وہ بر واقفِ حال کے سامنے ہیں۔

یہ چند مثالیں طمع و رغبت کے عقبات کی بیان ہوئیں۔ اب چند مثالیں عقبات خوف کی لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جو چیزیں ضرر ناک، خطرناک، ہولناک نظر آئیں انسان نے ان کو بھی خدائی میں شریک بنا لیا۔ انسان اپنی بے اعتدالیوں، گندگیوں اور کاہلیوں کی سزا کے طور پر بیماریوں میں مبتلا ہوا۔ یہ اس لیے کہ انسان اعتدال، طہارت اور مستعدی کے اس نقطۂ کمال تک ترقی کرے جو اس کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کا مقتضی ہے۔ لیکن انسان کے نفس پر اعتدال کی پابندیاں، صفائی کی احتیاطیں اور مستعدی کی زحمتیں شاق گذریں۔ اس نے سہولت اسی میں دیکھی کہ ان بیماریوں کے اندر روحیں مان کر ان کی دہائی دینے لگا، اور ان کو نذریں اور قربانیاں پیش کرنے لگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے اور وہ بجائے اس کے کہ آئندہ آنکھیں کھول کر چلے اور جلد بازی سے احتراز کرے، ٹھوکر لگانے والے روڑے کے پاس ایک مندر بنا کے اس کے سامنے

ڈنڈوت شروع کر دے۔ یا ایک شخص کے کپڑوں میں جوئیں پڑ جائیں اور اس کو ستائیں لیکن نہانا اور کپڑے دھونا اس کو شاق ہو تو ان کے دفع کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ ہر صبح کو ان کی جے پکارنے لگے۔

اسی طرح انسان نے دیکھا کہ سانپ ڈستے ہیں، بچھو ڈنک مارتے ہیں، شیر بھیڑیے پھاڑ کھاتے ہیں۔ خدا کی ان مخلوقات میں جہاں بہت سی حکمتیں ہیں وہاں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی تھی کہ یہ انسان کو مدنیت، اجتماعیت، اور نظافت کی اعلیٰ قابلیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے محرک کا کام دیں کہ وہ جنگلوں کو صاف کر کے میدان بنائے، پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے، انفرادی زندگی ترک کر کے مدنی و اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اپنے دشمنوں کو دفع کرنے کی عقلی و جسمانی قابلیتوں کو فروغ دے۔ اگر یہ درندے اور اژدہے نہ ہوتے تو انسان خود ہی درندوں کے بھٹوں اور اژدہوں کے غاروں میں رہنے والی ایک مخلوق بن جاتا اور مدنیت کے یہ سارے جلوے جو آج نظر آرہے ہیں ظہور میں نہ آتے۔ لیکن جن انسانوں کو یہ تبدیلی شاق معلوم ہوئی اور وہ جس حال میں تھے اسی میں انھوں نے رہنا چاہا۔ انھوں نے جنگل کے ان دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی کہ اس طرح ان کو راضی رکھ کر ان کے خطرات سے مامون رہ سکیں۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی کاہل الوجود انسان کسی گندی جگہ میں گھر گیا ہو یا کسی دھوئیں بھرے ہوئے مکان کے اندر بند ہو گیا ہو اور اس کی قوتِ شامہ اور اس کے تنفس کا دباؤ اسے مجبور کرے کہ وہ باہر کسی کھلے ہوئے میدان میں اور تازہ ہوا میں نکلے لیکن اس کی کاہلی اس سے مانع ہو اور وہ غلاظت کے ڈھیر یا دھوئیں کی عبادت شروع کر دے کہ اے غلاظت کی روح اور اے دھوئیں کے دیوتا! مجھ پر ترس کھاؤ! تمھاری دہائی ہے!

اسی طرح قدرت نے، جو ہر گوشہ میں رحیم و مہربان واقع ہوئی ہے، کبھی کبھی اپنے عدل کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے زمین کو ہلا دیا، کبھی پہاڑوں سے آگ برسا دی، کبھی ہواؤں کو طوفان بنا دیا، کبھی آسمان سے بجلیاں گرا دیں تاکہ انسان خدا کی رحمت کے غرہ میں اس کے عدل کو نہ بھول بیٹھے بلکہ اس کی نقمت کو بھی یاد رکھے کہ اگر اس میں طغیان پیدا ہوا تو خدا ان ہی چیزوں میں سے جو اس کی نفع رسانی کے لیے ہر وقت سرگرم

کار ہیں، جس چیز کو چاہے گا اس کے لیے سرکش بنا دے گا لیکن انسان بجائے اس کے کہ ان تازیانوں کے ڈر سے خدا کی طرف بھاگے وہ ان تازیانوں ہی کی طرف بھاگا اور جس طرح اس نے نعمتوں کو منعم کی حیثیت دے دی تھی اسی طرح اس نے نقمتوں کو منتقم کا درجہ دے دیا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ جس نے اپنی رعیت کو ہر طرح کا امن وچین دے رکھا ہے، کبھی کبھی اپنی افواج قاہرہ کا مظاہرہ کرے کہ رعایا یاد رکھے کہ جس بادشاہ کے پاس امن وراحت کے یہ سامان ہیں اس کے قبضۂ قدرت میں تادیب وتعذیب کی یہ قوتیں بھی ہیں۔ لیکن رعایا یہ کرے کہ ان قوتوں ہی کو بادشاہ بنا کر ان ہی کی تعظیم وبندگی کرنے لگے۔

اسی اصول پر وہ لوگ بھی معبود بن گئے جن کو ان کی سرکشی اور طغیان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس لیے مہلت دی کہ وہ اپنی اجلِ مقدر کو پہنچ جائیں، نیز ان کے ذریعہ سے ان لوگوں کی جانچ ہو سکے جو اُن کے کسی نوعیت سے زیردست ہیں کہ وہ اپنی روح کے عہد پر قائم رہتے ہیں یا اپنے جسم وتن کے مفاد پر اس عہد کو قربان کر دیتے ہیں۔ اس زمرہ میں شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں شامل ہیں اور دنیا کی پوری تاریخ میں یہ قانونِ امہال وسنتِ ابتلاء نمایاں ہے۔ قارون، ہامان، فرعون، ابولہب، ابوجہل اور دنیا کے تمام جبابرہ وشیاطین اس قانون کی ایک صف میں ہیں اور نوح، ابراہیم، موسیٰ، محمد علیہم السلام اور اللہ کے تمام صالح اور مخلص وموحد بندے اس کی دوسری صف میں۔ یہ کشمکش ابتداء سے جاری ہے اور قانونِ الٰہی کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی۔ کتنے ہیں جو اپنی رُوح کے تقاضے کو جانتے ہوئے کسی طمع یا کسی اندیشے سے ان جبابرہ اور طاغوتوں ہی کی عبادت شروع کر دیتے ہیں اور انہی کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ لیکن کچھ خدا کے ایسے بندے بھی نکلتے ہیں جو کسی حال میں بھی اپنے خدا اور اپنی روح سے شرمسار نہیں ہوتے اور خدا کے عہد پر قائم رہتے اور دوسروں کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شر کے اسی خوف نے شر پرستی کو ایک مستقل دین بنا دیا اور مجوسیوں نے خیر وشر کے دو خدا قرار دیکر دونوں کی پرستش اختیار کی۔ اور ہندوؤں نے دنیا کی سلطنتوں کے ڈھنگ پر زندگی بخشنے والے، زندگی کی

حفاظت کرنے والے، اور زندگی لینے والے کی ایک تثلیث قائم کر دی۔ ایران و ہندوستان کی قوموں میں زمانۂ قدیم سے فلسفہ کا ذوق غالب رہا ہے اس وجہ سے انھوں نے اپنی حماقتوں پر فلسفہ کا روغن مل دیا ورنہ ان کا اصل سبب بھی وہی دناءت ہے جو مختلف بھیسوں میں ظاہر ہوئی ہے اور ہر بھیس میں یکساں نفرت انگیز اور گھنونی ہے۔ تعجب ہے کہ ان قوموں پر فلسفہ کے غلبہ کے باوجود کائنات کے اضداد کے اندر توافق کا راز واضح نہ ہو سکا حالانکہ اس کے ہر تضاد کے اندر وہی وحدت مقصد مضمر ہے جو زوجین میں ہوتی ہے اور قرآن نے اس کو گوناگوں شکلوں میں بیان کیا ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ ہمارے رسالہ توحید میں آئے گی۔

یہ چند مثالیں محض رہنمائی کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ آپ بت پرستی کی کوئی تاریخ اٹھا کر اس نقطۂ نظر سے پڑھ ڈالیے، آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غیر اللہ کی عبادت و طاعت، خواہ وہ مردہ خداؤں کی پوجا کی شکل میں ہو یا زندہ خداؤں کی بندگی کی صورت میں نتیجہ ہے صرف انسان کی دناءت کا۔ اسی دناءت کی ایک شکل تقلید اعمیٰ بھی ہے۔ انسانوں کے ایک بڑے حصے نے نہ تو کبھی خود حقیقت پر غور کیا نہ دوسرے غور کرنے والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے بندوں کی دعوت پر غور کیا۔ انھوں نے باپ دادا کو جس ڈگرے پر پایا اسی پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہے۔ ان کو یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوا کہ باپ دادا کے رستہ سے کوئی الگ راہ نکالیں۔ لیکن اگر انسان جانور نہیں ہے بلکہ ایک عاقل اور صاحب اختیار و ارادہ مخلوق ہے تو جانور بن جانا اور اپنی عقل کو معطل کر دینا اس کی دناءت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

یہ سطریں لکھتے وقت ہم اس امر سے غافل نہیں ہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو طریقۂ آبا کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ انھوں نے روش قدیم میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے فکر و نظر کے زور سے وقت کے رجحانات کا رُخ پھیر دیا۔ بہتیرے ایسے بھی ہوئے جنھوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ بعض ہمت وروں نے تو زہر کا پیالہ تک پی لیا، بایں ہمہ توحید کا راز ان پر نہ کھل سکا اور وہ انہی ضلالتوں میں بھٹکتے رہے جن میں ان کی پوری قوم بھٹک رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اکثر

ایسے تھے جو بہت سے عقبات طے کرنے کے باوجود قوم پرستی کے عقبہ کو عبور نہ کر سکے اور توحید خالص تک پہنچنے کے لیے یہ شرط ہے کہ آدمی کوئی تسمہ لگا نہ چھوڑے۔ اور یہ سعادت یا تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے یا ان لوگوں کو جو ان کی پیروی کی ہمت کریں اور اللہ کی طرف سے اس کی توفیق پائیں۔

اوپر ہم نے شرک کا جو سبب بیان کیا ہے قرآن مجید اور قدیم صحیفوں سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے (اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ ظلم، عدل کا ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کی حق تلفی کرنا۔ اوپر ہم یہ بات تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ انسان پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے۔ بس اس کے حق میں کسی کو ساجھی قرار دینا لازماً سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے، اسی وجہ سے یہ ظلم عظیم ہوا۔ اور حق تلفی کا ونارت ہونا بدیہی ہے۔ اور جس درجہ کی حق تلفی ہوگی اسی درجہ کی ونارت بھی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم صحیفوں میں شرک کو چھنال عورت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ "خداوند خدا غیور ہے جس طرح تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ اس کا بندہ غیر کی بندگی کرے"۔ یہ تشبیہ بنی اسرائیل کے صحیفوں میں بار بار آئی ہے۔ قرآن مجید کی پاکیزگیٔ بیان نے اس تشبیہ کو بعینہٖ تو نہیں اختیار کیا لیکن اس کے مفہوم کو نہایت خوبی کے ساتھ لیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ قرآن میں شرک اور زانی اور مشرکہ اور زانیہ کو ایک ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ نور میں فرمایا ہے اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (زانی نکاح نہ کرنے پائے مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک اور مومنوں پر یہ حرام ہے) دو چیزوں کا ایک ساتھ اجتماع بغیر کسی اشتراک کے نہیں ہوتا۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر آدمی جب غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اور چھنال عورت میں نہایت گہری اخلاقی مناسبت ہے۔ چھنال عورت اپنے تئیں ایک مرد کے حبالۂ عقد میں دیتی ہے۔ اس کو اپنی حرمت کا مالک بناتی ہے۔ اس سے نان نفقہ اور تمام حقوق حاصل کرتی ہے لیکن اس کے باوجود شوہر کے حق اور اس کی حرمت میں ایک غیر مرد کو شریک کرتی ہے۔ ٹھیک یہی حال ایک مشرک کا ہے

وہ خدا سے ربوبیت کا اقرار کرتا ہے۔ "بلیٰ" کہہ کر اس کے ساتھ اپنی بندگی کا عہد باندھتا ہے۔ رہتا اس کے گھر میں ہے، کھانا اس کا کھاتا ہے، پانی اس کا پیتا ہے، کپڑے اس کے دیے ہوئے پہنتا ہے اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بندگی غیر کی کرتا ہے۔ محبت کا دم دوسروں کے لیے بھرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت ایک زانیہ کی ہوسکتی ہے یا ایک مشرک کی۔ روئے زمین پر یہی دو بے وفائیاں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے مشبہ اور مشبہ بہ کا کام دے سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکوں کو قرآن نے "خائن" بھی کہا ہے اور خیانت عورت کی بے وفائی اور عہد شکنی کے لیے عربی زبان کا ایک متداول لفظ ہے۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوگیا کہ قرآن مجید میں کیوں بار بار یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری خطاؤں کو جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا مگر شرک کو نہیں معاف فرمائے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک شریف اور غیور شوہر اپنی بیوی کی ہر غلطی معاف کر دے سکتا ہے لیکن اس کی بے وفائی کو ایک لمحہ کے لیے بھی معاف نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ دیوث، کمینہ، لئیم اور بے غیرت جانور ہے۔ جب انسان کی غیرت کا یہ عالم ہے تو پھر اس کی غیرت کا تصور کون کر سکتا ہے جس کے جمالِ غیرت کے ایک ادنیٰ پرتو سے یہ تمام عالم جمالِ عفت و حمیت سے نورانی ہوا۔ وہ اس بندہ کو کیسے معاف کر سکتا ہے جس نے غیر کی بندگی کا داغ اپنے دامن پر لیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ اس آیت کے اسمائے حسنیٰ میں سے خصوصیت کے ساتھ "متکبر" کی صفت پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی کس طرح شرکا و انداد سے اپنی تنزیہہ فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو متکبر ہے اور جس کے سوا کسی کے لیے بھی کبریائی زیبا نہیں ہے اس کی غیرت و کبریائی کبھی کسی شریک کو گوارا نہیں کر سکتی۔

زنا اور شرک کی اسی مشابہت کی وجہ سے شرک کو جگہ جگہ رجس (ناپاکی) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا

ہے اور مشرکوں کو "نجس" کہا گیا ہے۔ اور یہی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان خائنوں سے اپنے حرم کو پاک کرنے کا حکم دیا کہ خدا اپنے حرم میں یہ بے حرمتی گوارا نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ جو جماعت اس نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے وہ اللہ کے قہر و غضب کی زد میں آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ شرک کی شناعت سے واقف ہیں وہ پہلے سے اس قوم کی موت کا فیصلہ کر دیتے ہیں جو شرک کے جراثیم قبول کر لیتی ہے۔ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۔

شرک سے خدا کے حقوق جس طرح تلف ہوتے ہیں یہ بالاجمال اس کا بیان تھا۔ اب اس پہلو پر غور کیجیے کہ شرک خود اپنے نفس پر بھی سب سے بڑا ظلم ہے اور اس اعتبار سے بھی یہ ذلت اور ضلالت ہی ہے۔

او پر معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عزت بخشی ہے اور اس کو جو قوتیں اور قابلیتیں عنایت کی ہیں اگر وہ دنا تو انیوں یعنی بچپن اور بڑھاپے کی بیچارگیوں کے درمیان گھری ہوئی نہ ہوتیں تو اس کے لیے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ تھا۔ اس کی طبیعت کے علو اور تمام کائنات پر اس کے شرف و مزیت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی کی بندگی کرنے کے بجائے خود معبود بننے کا خواہشمند ہوتا۔ لیکن ان تمام عظمتوں کے باوجود جب وہ دیکھتا ہے کہ نہ میں خود اپنے آپ کو اس دنیا میں لایا، نہ یہاں اپنے آپ کو رکھنے پر قادر ہوں اور نہ میں نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی کسی چیز کو بنایا، نہ ایک مکھی یا بھنگے کے بنا سکنے کی بھی مجھے قوت حاصل ہے تو وہ ضعف و عجز کے تذلل اور شکر و سپاس کے خشوع کے ساتھ ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دیتا ہے۔ اور یہ وہ اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ اس کی عقل مطمئن ہوتی ہے، نہ اس کے دل کو چین نصیب ہوتا، نہ اس کائنات کا معمہ حل ہوتا۔ یہ کر چکنے کے بعد اس کے دل کی ساری پریشانیاں اور عقل کی ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور کائنات کے اسرار کو حل کرنے کے لیے وہ سراغ جاتا ہے جس سے ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس

ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جن کے آگے سر جھکانا ہے تو اس کا بارِ ثبوت اس کے ذمہ ہے۔ وہ تو یہ کہہ کے الگ ہو جائے گا کہ میرے علوئے نفس نے یہ ایک کے آگے پست ہونا اس لیے گوارا کر لیا کہ اس کے بغیر پناہ نہیں۔ اور اس کے بارے میں ہم اور تم دونوں متفق ہیں۔ باقی اس کے علاوہ جن کا ذکر کرتے ہو ان کی دلیل لاؤ۔ مجھے خواہ مخواہ بہت سے خدا بنانے کا شوق نہیں ہے۔ میرے لیے تو ایک ہی رب و مولیٰ بس ہے۔ جب کوئی غلام یہ پسند نہیں کرتا کہ کئی آقاؤں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے تو میں یہ ذلت و دنائت کیوں گوارا کروں۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (یوسف) ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْہِ شُرَکَآءُ مُتَشٰکِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ۔ ھَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (زمر۔ ۲۹)۔ لیکن جو دنی الفطرت تھے انھوں نے اپنے نفس کی کوئی قدر نہیں کی اور خدا کی خلافت کا رتبہ پا کر انھوں نے اپنے حقیر سے حقیر خادموں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب بنایا۔ اور اپنے نفس کی وہ اہانت کی جس سے بڑی کوئی اہانت نہیں ہو سکتی۔ وَمَنْ یُّھِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ۔ اور وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ الآیہ میں اسی رذالت و دنائت کی طرف اشارہ ہے۔

رسائل و مسائل

تحریکِ اقامتِ دین کے متعلق چند مسائل

سوال جماعتِ اسلامی کی شرکت کو اپنے لیے لازمی سمجھ لینے کے باوجود مجھے چند شبہات اپنے دل میں کھٹکتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو اپنی بصیرت سے ان الجھنوں کو صاف کر دیجیے۔ شبہات یہ ہیں:-

۱- آپ اپنی تحریروں کے ذریعے برسوں سے اقامتِ دین کی دعوت دے رہے ہیں۔ دو سال سے جماعت بھی قائم ہے۔ بقول آپ کے اس تحریک کے مزاج کے مطابق بہت تھوڑے آدمی ملے ہیں اور جو ملے ہیں ان میں وہ صفات بہت کم ہیں جن صفات کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ صفات لوگوں میں کیسے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ جہاں تک امت کی تاریخ کا تعلق ہے، خلافتِ راشدہ کے بعد اقامتِ دین کی منظم تحریک کبھی برروئے کار آئی ہی نہیں۔ مجددین نے زبان و قلم یا جسم سے جو کچھ کیا، ذاتی طور پر کیا۔ شاید پورے اسلامی دور میں صرف حضرت سید احمد بریلوی کے زیرِ علم ایک منظم جہاد اس مقصد کے لیے کیا گیا۔ میں ان کے رفقاء کے عزم و عمل پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں وہ والہانہ اور مجنونانہ جذبۂ جوش کیسے پیدا ہوا۔ کسی جماعت میں وہ نشہ کیسے چڑھ گیا ہے جب وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر دینا ہی اپنا عزیز فرض سمجھنے لگتی ہے؟ کیا یہ سب کچھ تحریری اور تقریری دعوت و تفہیم سے ہو جاتا ہے یا محض عمدہ اور صحیح لٹریچر فراہم کر دینے سے؟ میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب چیزیں ذہنی اصلاح تو کر دیتی ہیں لیکن جنونِ عمل پیدا کرنے والی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ عہد کر کے اس کا حق ادا نہیں کرتے اور خلوص و ایثار کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبہ کو کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ میں آپ کا لٹریچر پڑھ کر اور قرآنِ حکیم کا

مطالعہ کر کے خود اپنے اندر یہ خواہش پاتا ہوں کہ میرے عمل میں انقلاب ہو۔ لیکن جس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہوں وہ پیدا نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں وہ کونسی طاقت ہے جو اس ضرورت کو پورا کرتی ہے مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب تک جماعت اسلامی میں یہ طاقت نمودار نہ ہوگی، شرکائے جماعت میں ایثار و عمل کا مطلوبہ جذبہ پیدا نہ ہوگا اور تحریک ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

۲۔ ایک الجھن اقامتِ دین کی راہ کے نشانات اور مراحل کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جس طرح کے مراحل دیے گئے ہیں، ان میں جس طرح کی رہنمائی ہوتی گئی اور جس طرح کی غیبی نصرت و تائید کا ظہور ہوتا گیا، ان سب میں ذاتِ رسول اور وحی کی رہنمائی موجود تھی۔ اب یہ کون بتائے گا کہ ہمارے راستے کے مراحل کون کونسے ہیں اور ان کو کس کس طرح عبور کرنا ہے؟

۳۔ صحابہ کی زندگی کو دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، محتاج اور غنی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک وسیع خاندان کے رشتہ میں پروئے گئے تھے۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہوتی تھی اور ایک کا فاقہ سب کا فاقہ ہوتا تھا۔ ایک کا بوجھ اٹھانے کے لیے سب کے بازو حرکت میں آ جاتے تھے۔ مگر ہمارا حال کیا ہے؟ اگر ہمارے بچے فاقہ کشی کر رہے ہیں اور ہم فکرِ معاش میں بدحواس ہو رہے ہیں تو ہم اپنے رفیقوں کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں جو ان مشکلات کی تلخیوں سے ناآشنا ہیں۔ کبھی کبھی اس الجھن میں پڑ جاتا ہوں کہ وہ زندگی جو عہدِ رسالت میں صحابہ کے اندر پیدا ہو گئی تھی، اس عہد کے لیے خاص نمونہ تھی۔ کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ اس زندگی کی فطرت ہی ایسی ہے کہ یہ عام نہیں ہو سکتی۔ میں سوچتا ہوں کہ ہمیں اپنے جذبۂ رفاقت کو اتنا زوردار بنانا چاہیے کہ جماعت ایک خاندان کی شکل اختیار کر جائے اور جماعت کے استحکام کے لیے یہ ایک لازمی چیز ہے۔

جواب ۱۔ اس مسئلہ پر میں خود برسوں غور کرتا رہا ہوں اور آخر کار اُس مختصر سے فقرے نے جو عام طور پر مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے، مجھے مطمئن کر دیا، یعنی "السعی منی والاتمام من اللہ"۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم جس بات پر مامور ہیں وہ صرف یہ ہے کہ مختلف راہوں میں سے اس راہ کو اپنے لیے منتخب

ایسی جسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے، اور اپنی تمام ممکن سعی وجہد اس پر چلنے میں صرف کر دیں۔ اس کے بعد اسباب کی فراہمی اور رہ نوردی کی قوت اور مشکلاتِ راہ کی تسہیل، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اگر بڑے پیمانہ پر سعی کرنے اور بلند درجے پر پہنچنے کی توقع نہ ہو تو ہم صحیح راہ کو چھوڑ کر کسی ایسی غلط راہ کی طرف چل پڑیں جس میں کچھ بڑے اور بلند درجے کا کام کیا جاسکتا ہو۔ ہمیں بہرحال صحیح کام کرنا ہے، خواہ وہ بڑے پیمانے پر ہو یا چھوٹے پیمانے پر۔

یہ تو اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جن غیر معمولی اخلاقی قوتوں کی اس کام کے لیے ضرورت ہے اور جیسی مؤثر شخصیت یا شخصیتیں اس کام میں جان ڈالنے کے لیے ضروری ہیں وہ بہرحال حجروں میں پیدا نہیں ہو سکتیں بلکہ اس راہ کی عملی جدوجہد کے نتیجہ ہی میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ابھی اس سعی کی ابتدا ہے اور آزمائش کے لمحات بہت کم آئے ہیں، اس وجہ سے اس سعی کے مردم ساز اثرات آپ کے سامنے پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن آگے چل کر جیسے جیسے امتحان کے مواقع سامنے آتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اللہ سے گہرا تعلق رکھنے والے نہیں ہیں وہ کسی نہ کسی امتحان کی گھڑی پر اپنی کمزوری کے خود شکار ہو جائیں گے اور راستے سے ہٹ جائیں گے، اور جن لوگوں کو فی الواقع اللہ سے تعلق ہوگا وہ نہ صرف یہ کہ ایک ایک امتحان کے موقع پر کامیاب ہوں گے بلکہ ہر امتحان ان کی سیرت میں ایک نئی طاقت پیدا کر دے گا، ان کے اندر کی بہت سی کھوٹ نکال دے گا اور بالآخر وہ زرِ خالص بن جائیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ انہی لوگوں میں پارس کی سی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی کہ جو ان سے چھو گیا وہ سونا بن گیا۔ بہرحال میں اس معاملہ میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ اس کام کو شروع کرنے سے پہلے مکمل شخصیت یا شخصیتوں کی شرط لگانا غلط ہے۔ یہ شرط کبھی متحقق نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ ایک مرتبہ خلوصِ نیت کے ساتھ کام شروع کر دیا جائے تو رفتہ رفتہ یہی کام خود مکمل شخصیتیں بناتا چلا جاتا ہے اور جتنا جتنا یہ اپنی تکمیل کے مراحل کی طرف بڑھتا ہے اتنی ہی بلند تر شخصیتیں اس کے کارکنوں میں سے ابھرتی چلی آتی ہیں۔ سمندر کی موجوں سے لڑنے کے لیے آپ ایسے آدمی کبھی نہیں لا سکتے جو سمندر کے اندر اترنے سے پہلے اس کی موجوں سے لڑنے کی قوت فراہم

کر چکے ہوں۔ یہ قوت تو بہرحال سمندر میں کودنے اور موجوں سے لڑنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جو کمزور ہیں وہ اسی سمندر میں ڈوب مرتے ہیں اور جن کے دست و بازو میں اس نے قوت پیدا کی ہے وہ تھپیڑے کھا کھا کر اور موجوں سے لڑ لڑ کر بالآخر پیراکوں کے پیراک بن جاتے ہیں۔

۲۔ اقامت دین کی راہ کے مراحل مقرر نہیں ہیں، بلکہ ان مراحل کو جدوجہد، اور وہ حالات جو جدوجہد کے دوران میں پیش آئیں، اور وہ بصیرت جو اسلام کی روح کو سمجھنے والے رہنما کے اندر ہوتی ہے، یہ سب چیزیں مل جل کر معین کرتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں میں بھی ہم کو یہی نظر آتا ہے کہ سب کے سب ایک ہی قسم کے مراحل سے نہیں گذرے ہیں۔ حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ، حضرت یوسف اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل جو چیز درکار ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے مقصد معین ہو اور ہمارے اندر وہ حکمت موجود ہو جو اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے اور ہم انبیاء علیہم السلام کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ کر عملاً جدوجہد شروع کر دیں۔ پھر جو جو مراحل سامنے آتے جائیں گے ان میں سے ہر مرحلہ کے تقاضوں کو ہم اپنی حکمت سے سمجھتے جائیں گے اور اللہ کے بھروسے پر ان کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرتے جائیں گے۔

رہا آپ کا یہ خیال کہ پہلے تو وحی کی رہنمائی کام کرتی تھی اس لیے صحیح وقت پر صحیح تدبیر اختیار کر لی جاتی تھی، مگر اب کیا ہو گا؟ تو اس کا جواب قرآن مجید میں دے دیا گیا ہے کہ "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا"۔ وہ خدا جو پہلے رہنمائی کرتا تھا وہی اب بھی رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے والے موجود ہونے چاہییں۔ ہمارے اندر اگر ایک دو آدمی بھی ایسے موجود ہیں جو قرآن کی روح اپنے اندر جذب کر چکے ہوں، اور جماعت میں کم از کم ایک معتدبہ اکثریت ایسے لوگوں کی موجود ہے جو قلب سلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اور صحیح و غلط رہنمائی میں امتیاز کر سکتے ہوں اور جن میں صحیح رہنمائی کے لیے سمع و طاعت کا مادہ موجود ہو، تو ان شاء اللہ خدا کی رہنمائی بھی ہمیں ہر مرحلہ پر حاصل ہو گی اور ہم اس کی رہنمائی سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے۔

۳۔ صحابہ کی جماعت کے متعلق جو نقشہ تذکروں میں کھینچا گیا ہے اس میں ایک حد تک تو مبالغہ ہے اور ایک حد

تک حقیقت ہے ۔ پھر جو حقیقت ہے وہ بھی پوری طرح اس وقت بر سرِ کار آئی تھی جب ایک طویل مدت کی جدوجہد نے ان کے اندر باہمی رفاقت کی اسپرٹ پیدا کر دی تھی ۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو خصوصیات ان کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زبردست رہنما کی رہنمائی سے چودہ پندرہ سال کی مسلسل تربیت کے بعد پیدا ہوئی تھیں، انھیں ہم پہلے ہی مرحلہ پر موجود دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر مدینہ طیبہ میں صحابہ کے درمیان رفاقت کی جو اسپرٹ تھی اس میں بہت بڑا دخل ان کی یکجائی کو بھی تھا۔ منتشر طور پر عرب کے مختلف حصوں میں جو لوگ پھیلے ہوئے تھے ان کے ساتھ وہ رفاقت ممکن نہیں تھی جو مدینہ میں کثرت سے آنے والے لوگوں کے ساتھ تھی۔ مگر یہاں ابھی تک ہماری اجتماعی زندگی سرے سے بنی ہی نہیں ہے۔ منتشر افراد ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو ابھی ایک دوسرے سے آشنا تک نہیں۔ ان کے اندر آخر رفاقت کی وہ شان کیسے پیدا ہو سکتی ہے جو صرف یکجائی زندگی ہی میں ممکن ہے۔ بہرحال میں یہ چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے ہم خیال ہیں وہ عہدِ صحابہ کو مجرد کرامتوں اور معجزات کی اسپرٹ میں سمجھنے کے بجائے فطری اسباب کے مطابق سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ہر وہ چیز جو اس دور میں پیدا ہوئی تھی اس کے متعلق ہم یہ چاہیں گے کہ بس وہ چشم زدن میں کرامت کے طور پر رونما ہو جائے اور جب وہ اس طرح رونما نہ ہو سکے گی تو ہمارے دل ٹوٹ جائیں گے۔ اس ذہنیت کے ساتھ ہم کبھی ان فطری اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش کریں گے ہی نہیں جن سے وہ کیفیات یا کم از کم اس نوعیت کی کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ ملیے اور مل کر کام کیجیے اور مل کر اس راہ میں مصیبتیں اٹھائیے۔ پھر اگر اس طرز کی رفاقت کا ظہور نہ ہو تو البتہ آپ کو حق ہے کہ اس خدمت کی انجام دہی کے لیے معجزہ کی شرط لگائیں اور اپنے خدا سے مطالبہ کریں کہ اگر یہ خدمت ہم سے لینا چاہتا ہے تو معجزے صادر کرے۔

اس سلسلہ میں سوچنے والے اکثر جو غلطیاں کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس کام میں جن جن چیزوں کی کمی محسوس کرتے ہیں ان کا ذکر کچھ اس انداز سے کرنے لگتے ہیں گویا ان ساری کمیوں کو پورا کرنا اور تمام ضروری چیزوں کو مہیا کر دینا کسی اور کا کام ہے اور خود ان پر اس بات میں کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ حالانکہ درحقیقت یہ کسی ایک شخص کا انفرادی کام نہیں ہے بلکہ ہم سب کا مشترک کام ہے اور اس میں کوئی شخص بھی محض چند خامیوں کی نشان دہی اور چند چیزوں کی ضرورت ظاہر کر کے اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا جب تک وہ خود اس کمی کو پورا کرنے اور اس چیز کو مہیا کرنے میں اپنے حصہ کی خدمت انجام نہ دے جس کی ضرورت وہ بیان کرتا ہے۔

مطبوعات

Modern Islam in India

مولفہ مسٹر ڈبلیو، سی، اسمتھ لیکچرار ایف، سی کالج لاہور۔

قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ: منروا بک شاپ، انار کلی، لاہور۔

اس کتاب کے موضوع سے ملتے جلتے موضوعات پر عیسائی مستشرقین نے اسلام یا مسلمانوں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر ہمیشہ نامکمل معلومات کی اساس پر متعصبانہ نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی طرز کی ایک تحریر ہے۔ مولف "عیسائی" ہے اور پھر سوشلسٹ، اور یہ دونوں تعصب اس کی تحریر میں نمایاں ہیں۔

ایسی تالیفات کا حقیقی مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ دنیا کے مادہ پرستانہ سیاسی و معاشی مذاہب کے مقابلہ میں مسلمانوں کو حقیقی اسلام کے احیاء سے روکا رکھا جائے۔ اسی نوعیت کے لٹریچر نے ہمارے ہاں متجددین پیدا کیے ہیں جو مغربیت کے تقلید کی طرف اقدام کرتے ہوئے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ اس قسم کی انگریزی کی بڑی بڑی کتابوں میں "ترقی پسند" (Progressive) کی حیثیت سے پیش کیے جائیں۔

یہ جرأت دیکھیے کہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق قلم اٹھاتے ہوئے ایک شخص اتنی کم معلومات لے کر اٹھتا ہے کہ وہ "اسلام" اور "مسلم" کی صحیح تعریف تک قائم نہیں کر سکتا۔ اسمتھ صاحب کے نزدیک "مسلم" "وہ ہے جو مسلم کہلاتا ہو" اور اسلام وہ طریق کار ہے جس پر مسلمان چلتے ہیں۔ پھر ادارات اور جماعتوں کی قسم بندی کا معیار ملاحظہ کیجیے تو مولف کے کمال فکری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ موصوف اسلام سے دور اور اپنے نقطۂ نظر سے قریب ہوتے جانے والوں کو تو "ترقی پسند" مسلمان قرار دیتے ہیں اور اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے والوں کو "رجعت پسند" مسلمان کا نام دیتے ہیں۔ اقبال پر تو خوب ستم ڈھایا گیا ہے۔ اس بیچارے کے فکری وجود کو آرا چلا کر دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ علم و حکمت اور عمل و حرکت کی دعوت دینے والے اقبال کو تو مغربی اثرات کا نتیجہ قرار دے کر ترقی پسند شمار کیا ہے اور مغرب کے نظام باطل کے خلاف زور لگانے والے اقبال کو اس کی مذہبیت کی بنا پر رجعت پسند گنا ہے۔

جہاں تک مدیر "ترجمان القرآن" کا تعلق ہے، مولف نے ان کی کتابوں کا ضرورت سے بہت کم مطالعہ کیا ہے اور صرف رسالہ دینیات اور اسلام کا نظریہ سیاسی، دو چیزیں دیکھ کر رائے قائم کر لی ہے۔ حالانکہ پروفیسر موصوف کے لیے مشکل نہ تھا کہ وہ ان کا پورا لٹریچر ملاحظہ کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود بھی ان سے انصاف کی بہت کم توقع کی جا سکتی تھی تاہم تحقیق کا حق تو ادا ہو جاتا، اور وہ کم از کم کسی شخص کے خیالات کی غلط ترجمانی کرنے کے مرتکب نہ ہوتے۔

کتاب ترتیب السور الکریمۃ و تناسبہا فی النزول و فی المصاحف

تالیف علامہ موسیٰ جار اللہ۔ صفحات ۳۵۲

قیمت اور ملنے کا پتہ معلوم نہیں۔

یہ کتاب مشہور تاتاری عالم علامہ موسیٰ جار اللہ کی تالیف ہے۔ اس میں موصوف نے قرآن کی سورتوں کو ان کے نزول کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے اور ہر سورہ کا ربط و نظم ایک طرف نزولی ترتیب کی رُو سے واضح کیا ہے اور دوسری طرف مصاحف میں جو سورتوں کی ترتیب ہے اس ترتیب کی حکمت بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے کتاب جستہ جستہ دیکھی ہے۔ مستشرقین کی دیکھا دیکھی نزولی ترتیب کی سُراغ رسانی کا شوق مسلمانوں میں بھی ترقی کر رہا ہے حالانکہ یہ ترتیب دین میں معتبر ہے اور نہ اس کی تحقیق کا کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ مختلف روایات کو جمع کرنے اور قیاسات کی مدد سے اگر کوئی نقشہ بنا بھی لیا جائے تو اس پر اس قدر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں نظم و ربط تلاش کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ کتاب اس سعیِ لاحاصل کی ایک بہترین مثال ہے۔ معتبر ترتیب وہ ہے جو مصاحف میں پائی جاتی ہے اور لاریب یہ ایک عظیم حکمت پر مبنی ہے لیکن علامہ کی کوشش اس باب میں بھی کوئی خاص قیمت نہیں رکھتی۔ باہم دگر سورتوں میں جو نظم انھوں نے دکھایا ہے دنیا کی ہر دو مختلف چیزوں میں اس طرح کا نظم پایا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح کی مناسبت قرآن کی سورتوں یا آیتوں میں تلاش کر لینے سے نہ قرآن کی کوئی مشکل حل ہوتی ہے، نہ خلق کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بلکہ اس سے اُلٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لوگ اس قسم کے مصنوعی نظم کو دیکھ کر سرے سے نظم ہی سے بدگمان ہو جائیں گے اور قرآن پر بے نظمی کا جو الزام اب تک بے دلیل تھا، شاید وہ اس قسم کی کوششوں سے مدلل ہو جائے۔

کتاب کے آخر میں بعض بحثیں کتابت وحی، تاریخ ترتیب قرآن، صحابہ، رسول اور اختلاف قراءت سے متعلق ہیں۔ ان بحثوں میں بھی ہر طرح کا رطب و یابس مواد موجود ہے۔ البتہ ترتیبِ قرآن کی جو تاریخ مصنف نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے اگرچہ اس سلسلہ میں ہمیں مصنف کی بعض دلیلوں سے اختلاف ہے تاہم یہ کتاب اہلِ علم کو پڑھنی چاہیے۔ اس میں نقائص کے ساتھ ساتھ بعض فوائد بھی ہیں۔ کم از کم ان کتابوں کو دیکھ کر قرآن کے صحیح نظم کو دریافت کرنے کی اصلی ضرورت سامنے آتی ہے۔

تصریف القرآن الکریم

یہ علامہ موسیٰ جار اللہ کا دوسرا رسالہ فن صرف میں ہے۔ اس میں مثالیں بیشتر قرآن مجید سے دی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی زبان سے مناسبت پیدا کرے گا۔ اس میں علمِ صرف کے اونچے مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس وجہ سے مبتدی طلبہ کے لیے یہ مفید نہیں ہے۔ البتہ منتہی طلبہ اور اہلِ علم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ نحو و صرف کی متداول کتابوں کے مطالعہ سے اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ قرآن عربیت کے معروف اسلوب پر نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ نحو اپنے تتبع کی کمی کی وجہ سے قرآن کی بہت سی مثالیں قواعد کلیہ کے خلاف شواذ کے سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں۔ علامہ نے اس رسالہ میں قرآن کی زبان کو عربیت کے معروف اسلوب پر دکھانے کی کوشش کی

ہے۔ اور یہ اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر کوشش ہے۔ نحو وصرف کو اس طرح مرتب کر دینا کہ قرآن عربیت کے معروف اسلوب پر آجائے ابھی ہمارے علماء کے ذمہ باقی ہے۔ علامہ موسیٰ جار اللہ کا یہ رسالہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کیا عجب کہ اس رسالہ کو دیکھ کر دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے کی ہمت ہو۔

مختارات

جامع مولانا ابوالحسن علی، صفحات ۲۰۳، قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ دار العلوم بادشاہ باغ، لکھنؤ

یہ کتاب نثر عربی کے مختلف دوروں کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ نزول قرآن سے لے کر موجودہ دور تک کے اہلِ ادب کے کلام کے نمونے اس میں موجود ہیں۔ جامع نے اس کو عربی زبان کے طلبہ کی خاطر مرتب کیا ہے اور نہایت پاکیزہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ شروع میں کچھ قرآن کی سورتوں کے ٹکڑے ہیں، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے خطبات و مواعظ ہیں، اس کے بعد ہر دور کے کلام کے اچھے نمونے ہیں۔ لیکن ادوار کے لحاظ سے کلام کی ترتیب ناقد ماہرین کے لیے مفید ہوتی ہے طلبہ کے لیے صحیح ترتیب وہ ہے جس میں ادبی اور تعلیمی تدریج ملحوظ ہو یعنی وہ درجہ بدرجہ سہل سے صعب کی طرف بڑھیں اور اگر اس کے ساتھ کلام کے مختلف نمونوں میں معنوی ترتیب بھی قائم ہو سکے تو نور علیٰ نور ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک مناسب تدریج کے ساتھ وہ زبان بھی سیکھتے ہیں اور اعلیٰ مطالب بھی ایک موزوں ترتیب کے ساتھ جذب کرتے ہیں۔ اب تک اس اصول کو سامنے رکھ کر مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے اور افسوس ہے کہ اس تازہ ترین مجموعے میں بھی یہ نقص رہ گیا ہے۔

جامع نے تیمناً اس مجموعے کا آغاز قرآن کی آیات سے کیا ہے اور پھر قدرتاً اس کے بعد خطبات جاہلیت کے نمونوں کے لیے کوئی جگہ نہیں نکل سکی ہے۔ حالانکہ مختلف عبارات سے ان سے واقف ہونا طلبہ کے لیے ضروری ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ مجموعہ بہت زیادہ بے ربط ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا مضمون سابق ولاحق سے کسی مناسبت کے بغیر اچانک سامنے آتا ہے اور اس انتشار کی وجہ سے مشکل ہی سے طالب علم کے دل پر کوئی پائیدار اخلاقی نقش قائم ہونے پاتا ہے۔ اس طرح کے مجموعوں میں ضروری ہے کہ جو اخلاقی تعلیمات آئیں ان میں ایک سسٹم ہو۔ بغیر سسٹم کے کوئی تعلیم پائدار نہیں ہو سکتی۔

فضائل القرآن

مولفہ جناب رفاقت حسین صاحب۔ ملنے کا پتہ۔ محمد عثمان صاحب تاجر کتب اردو بازار، دہلی۔

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو کسی ترجمہ قرآن کے مقدمہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں قرآن کی فصاحت وبلاغت، حاملین قرآن کے فضائل اور تلاوت کے آداب بیان کیے گئے ہیں۔ جو باتیں لکھی گئی ہیں احتیاط اور سلیقہ کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور کتاب قابلِ مطالعہ ہے

تاریخ امارت

از جناب مولانا عبدالصمد رحمانی ناظم امارت شرعیہ بہار قیمت عمر۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

مولانا رحمانی صاحب نے اس تالیف میں امارت شرعیہ بہار کے نشو وارتقا کی تاریخ بیان کی ہے اور اس کے مختلف کارناموں

کا تذکرہ کیا ہے۔ موصوف کے بیان کے مطابق امارتِ شرعیہ کی ضرورت کا آغاز ۱۸۰۳ء کے اس منحوس دن سے ہوتا ہے جس دن غیر ملکی اقتدار نے یہ نعرہ بلند کیا:۔

"ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا"۔

مولف کے نزدیک اسی دن دارالاسلام نے دارالکفر کی شکل اختیار کی اور اسلامی سیاست، اسلامی حقوق اور اسلامی مفاد کی نگہداشت اور صیانت کے لیے اسی دن سے ایک دینی امارت کی ضرورت پیدا ہوئی۔ مگر ہم یہ نہیں سمجھے کہ اُس سیاسی نظام کو مولانا کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جس کا نعرہ یہ تھا:۔

"ملک خدا کا اور حکم مغلیہ خاندان کا"

آگے چل کر ایک اور عجیب و غریب بحث مطالعہ میں آتی ہے۔ یعنی فاضل مصنف ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کو دو دوروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور وہ جو ۱۸۰۳ء سے شروع ہوا اور اسے وہ انقلابی دور کا نام دیتے ہیں اور دوسرا دور وہ جو انقلابی دور کے آخری امام مولانا محمود الحسن صاحب کی اسارتِ مالٹا ۱۹۱۶ء کے چند ہی مہینہ بعد سے شروع ہوا اور اسے وہ آئینی دور کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے ارشاد کے مطابق اس دور کی تعریف یہ ہے کہ اس میں قیامِ دین کی تمام جدوجہد غیر اسلامی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین کی حدود کے اندر سمٹ گئی۔ اگر اس دوسرے دور کو محض واقعہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا تو کچھ عجب نہ تھا، مگر محترم مولف اسے ناگزیر، صحیح اور واجب القبول قرار دیتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اعلائے کلمۃ اللہ اور احترامِ نظامِ کفر یہ دونوں نقیضین جمع کیسے ہو جاتے ہیں، مگر "تاریخِ اسلام" کے عجائب گھر میں اس سے بڑے بڑے عجائب و غرائب چھپے ہوئے ہیں۔ کاش کہ صاف صاف الفاظ میں یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ انقلابی دور میں جو گرم روح کام کر رہی تھی وہ انحطاط کے عمل سے جب زیادہ ٹھنڈی پڑ گئی تو مسلمان آئینی جدوجہد کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مگر اوپر کی سطور کا یہ مطلب نہیں کہ امارتِ شرعیہ بہار کے کارنامے کا وزن گرایا جائے۔ ہرگز نہیں۔ درحقیقت اس قابلِ قدر ادارے نے ہندوستان میں اسلام کے تحفظ کے لیے بہت کچھ کام کیا ہے اور مسندِ امارت جن جن لوگوں کے قبضہ میں رہی ہے ان کی بصیرت اور تقویٰ اور ان کی خدمات کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے۔

Our Future Educational programme

از جناب محمد فضل الرحمٰن صاحب انصاری۔ ایم اے (علیگ)۔ قیمت ۱۲/ر۔ ملنے کا پتہ:۔ دی علیگڑھ بکس اینڈ نیوز پیپرز ایجنسی، ۶۔ شبلی روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

یہ انگریزی کتاب مسلمانوں کی تعلیم کے پیچیدہ اور اہم ترین مسئلہ پر بحث کرتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے مسلمانوں کے لیے "غیر مسلم تعلیم" کے بجائے "مسلمان تعلیم" کا پروگرام تجویز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کی اہمیت کو موصوف نے

اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کو "مذہبی" اور "غیر مذہبی" دو حصوں میں تقسیم کرنا اور مروجہ نصاب کے ساتھ "دینیات" کے مضمون کو بطور ضمیمہ شامل کر دینا نہ صرف یہ کہ غیر مفید ہے بلکہ اُلٹا مضر ہے۔ اس طریق کار کی جگہ یہ کتاب پورے نظامِ تعلیم کو "مسلمان" بنانے کے حق میں ہے یعنی اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زباندانی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور فلسفہ، تمام مضامین کو "دینیات" بن کر رہنا چاہیے۔ اس اصول کی بنیاد پر نصاب کا جو تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ اگرچہ بسا غنیمت ہے مگر اس میں اختلاف کی گنجائش تو بہرحال ہے ہی۔

مصنف اپنی اسکیم کے عملی نفاذ کے لیے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کو منتخب کرتے ہیں۔ بس یہ ان کی نظر کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اداروں کو مسلمانوں کی جن کمزوریوں نے جنم دیا ہے ان کو سمجھ لینے کے بعد ان کی طرف کوئی شخص امید بھری نظر نہیں اٹھا سکتا۔ پھر یہ ادارے جن طاقتوں سے غذا حاصل کرتے ہیں ان سے کبھی یہ توقع وابستہ نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی حقیقی تعلیمی انقلاب کو گوارا کر سکیں گی، کجا کہ اس کو اپنے مال سے مدد دیں۔

Islam and Christianity in the Modern World

از جناب محمد فضل الرحمٰن صاحب انصاری ایم اے (علیگ)۔ قیمت درج نہیں۔ عیسائی حضرات ۸؍ کے ٹکٹ بھیج کر مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ دی علی گڈھ بکس اینڈ نیوز پیپرز ایجنسی، ۶ شبلی روڈ مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ۔

اس کتاب کا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ موجودہ علمی و عقلی اور بحرانی دور میں ملحدانہ تحریکوں کے مقابلہ میں عیسائیت کے قدم جم نہیں سکتے بلکہ اس سیلاب میں صرف اسلام ہی مضبوطی سے ٹھہر سکتا ہے۔ مصنف نے اسلام اور مسیحیت کا جو موازنہ کیا ہے وہ بائبل کی گہری تحقیق کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے، مگر اسلام کو یورپ کے سامنے رکھنے کے لیے موجودہ دور میں یہ مناظرانہ طریقہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ خود بائبل کی صداقت جدید یورپ کے لیے مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اب اسے بہت تھوڑے لوگ سند اور معیار مانتے ہیں۔ اب تو یورپ کو قطعی ملحد سمجھ کر مخاطب کرنا چاہیے۔

کتاب میں اسلام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ "وحدتِ نظامِ حیات" کے اصول پر قائم ہونے کی وجہ سے قابلِ قدر ہے۔

مذہب کا انقلابی تصوّر

از جناب مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی، بی اے۔ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دین و دانش، بانکی پور، پٹنہ۔

صدیقی صاحب کا یہ مقالہ ترجمان القرآن میں شائع ہو چکا ہے اور بے حد پسند کیا گیا ہے۔ اسے مطالعہ کرنے سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ مذہبیت کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں اسلام کا مطالبہ کیا ہے۔ سیاست، معیشت، معاشرت اور زندگی کے سارے میدانوں میں قیادت سے سبکدوش ہو جانے اور کفر کی رہنمائی قبول کر لینے

کے بعد مسلمان کے پاس اب چند بے جان سی نمازیں اور وظائف کی لسانی ورزشیں باقی رہ گئی ہیں، بس انہی کا نام اب مذہب ہے۔ یہ مقالہ اس غلط تصورِ مذہب کے خلاف ایک ذہنی جہاد ہے۔ صدیقی صاحب نے وحدتِ حیات کے اصول کی توضیح کر کے اس حقیقت کی خوب وضاحت کی ہے کہ سیاست اور تمدن کو کفر کے حوالے کر دینے کے بعد مسلمان ہونے کے کچھ زیادہ معنی نہیں رہ جاتے۔ افکار و اعمال کی ایک عظیم الشان مشین میں سے چند پرزے الگ کر کے اگر آپ انہیں ہزار بار بھی گھمائیں، جب بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوگا، جس کے لیے اصل مشین بنائی گئی تھی۔ ہمارے ہاں مقصد تو بھلا دیا گیا ہے اور مقصد کے لیے جو حرکات کی جاتی تھیں بس اُن کی نقالی جاری ہے۔ یہی علت ہے ہمارے خیالات اور کردار کی ساری بے ربطیوں کی۔ ہم اس اسلام کو کبھی دنیا میں غالب نہیں کر سکتے جو انسانوں کی سیاسی اور معاشی مشکلات کو حل نہ کر سکتا ہو اور صرف ایک "بہشتے فی سبیل اللہ" کا خواب دکھاتا رہے۔

پارلیمانی طرزِ حکومت

از جناب منظور الحسن صاحب ہاشمی، بی، اے۔ قیمت ۱۲؍۔ ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت سیاسیہ اشاعت منزل اردو گلی، حیدر آباد، دکن۔

موجودہ سیاسی دور میں دنیا کی بڑی بڑی ریاستوں کے نظامِ سیاسی کو سمجھنے کی ضرورت واضح ہے۔ افسوس ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو زبان میں اس غرض کے لیے دو چار کتابوں سے زیادہ کچھ نہ ملے گا۔ پیشِ نظر کتاب اگرچہ اونچے درجے کی چیز نہیں ہے تاہم اس کے مطالعے سے انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور آسٹریلیا کی جمہوریتوں کا ایک ڈھانچہ سامنے آجاتا ہے۔ اور علم السیاست کی چند ضروری اصطلاحوں کا محدود سا تصور حاصل ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی تہذیب

از جناب ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مجلس تہذیبِ اسلامی، حیدر آباد، دکن۔

یہ مقالہ ان لوگوں کی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے لکھا گیا ہے جو اسلامی تہذیب کو ڈاڑھی مونچھ کی مخصوص تراش اور پاجامے اور لوٹے کے ایک خاص انداز سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ ڈاکٹر صاحب اس تصورِ تہذیب کی تغلیط کر کے یہ واضح کرتے ہیں کہ تہذیب مظاہرِ تمدن کا نام نہیں، بلکہ یہ ان اصولوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو کسی تمدن کے اندر روح بن کر کام کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب سے معذرت چاہتے ہوئے ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ مقالہ میں بہت بڑے بڑے خلا رہ گئے ہیں اور مدعا الجھا ہوا سا ہے۔ دراصل "ہندوستان میں اسلامی تہذیب" جیسا موضوع مقالہ نہیں، مستقل تصنیف چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ محترم مؤلف اسلامی تہذیب کے صحیح تصور کو ذہن میں رکھ کر ترکی، ایران، عرب، مصر، فلسطین عراق اور افغانستان کے موجودہ نظامِ زندگی میں "اسلامی روح" کو "حریتِ فکر و عمل" کے پیچھے کیسے کوشاں پاتے ہیں، جیسا کہ مقالہ کے صفحہ ۲۱ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پھر یہ دعویٰ اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے کہ اسلام کے تصورِ حیات اور نظامِ اجتماعی کو خدا کا نام زبان پر لائے بغیر بھی کسی کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو تصورِ حیات، تصورِ انسان، معیارِ خیر و شر، نظام

اقدار، سب کی واحد اساس خدا اور اس کی صفات کا تصور ہے اور اسی وجہ سے پورے اوامر و نواہی میں "ایمان باللہ" کی روح جذب ہے۔ پھر خدا کے ذکر کے بغیر نظام اسلامی پر کوئی گفتگو کیسے ممکن ہے؟

مشاہیر کی بیویاں (حصہ اول) از جناب طاہر ورفعت۔ قیمت ۱۲۔ ملنے کا پتہ:- دار الاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین، اشاعت منزل، اردوگلی، حیدرآباد، دکن۔

بیوی انسان کی زندگی پر جو گہرے اثرات ڈالتی ہے ان سے کسی کو انکار نہیں ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر سے زیر تبصرہ کتاب میں اسٹالین، مسولینی، چرچل، روزولٹ، پولو، فرانکو اور ڈی ویلرا کی زندگی کی تصاویر پیش کی گئی ہیں جن کی مدد سے ان "بڑے آدمیوں" کی شخصیتوں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرا حصہ مشرق کے مشاہیر کی بیویوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔

رہنمائے وراثت از جناب قاضی میراں بخش صاحب ریٹائرڈ نائب تحصیلدار، ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ قیمت ۱۲؎۔ غالباً براہ راست مصنف ہی سے مل سکے گی۔

اسلام کے مخصوص معاشی نظام کی عمارت جن بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے ان میں سے ایک ستون قرآن کا قانونِ وراثت ہے۔ دنیا کے مروجہ قوانینِ وراثت کے برعکس یہ قانون دولت کی مرکزیت کو ختم کرکے طبقات کو توڑتا پھوڑتا رہتا ہے۔ اب جبکہ عالمِ انسانی سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک راہِ اعتدال کی تلاش میں ہے، ہمارا فرض ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشی کے ایک ایک شعبے کو پوری توضیح کے ساتھ مفکرین کے سامنے رکھ دیں۔ اس لحاظ سے قاضی صاحب کی کوشش بہت قابلِ قدر ہے۔ موصوف نے رہنمائے وراثت کو قانونی کتب کے طرز پر مرتب کیا ہے۔ توضیحِ اصطلاحات (متعلقہ موضوع) اور علامات مقرر کرنے میں فنی واقفیت سے خوب کام لیا گیا ہے۔ جہاں تک مشقی مثالوں میں ریاضی کو استعمال کرنے کا تعلق ہے قدرے بہتر انداز اختیار کیا گیا ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ ریاضی کے اسلامی نصاب تعلیم میں اگر ہمیں تقسیم وراثت کو داخل کرنا ہے تو یہ کتاب کسی حد تک مفید رہے گی۔ باقی رہا فقہی جزئیات کا معاملہ، سو اس سلسلہ میں کوئی تفصیلی رائے پیش کرنا مشکل ہے۔ صرف اتنا عرض کیا جاسکتا ہے کہ مختلف فرقوں کے مختارات کو ضروری حوالوں کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ کتاب کے مرتب کے پیشِ نظر انگریزی عدالتی و قانونی نظام ہے اور اس ذہنی تاثر کی جھلک کتاب میں جا بجا محسوس ہوتی ہے۔

اقبال کا تصورِ زمان و مکان از جناب پروفیسر رضی الدین صدیقی، ایم اے، پی، ایچ، ڈی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، دکن۔ قیمت ۱۰/۔ ملنے کا پتہ:- اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور۔

کائنات اشیاء اور حوادث سے عبارت ہے، اگر اشیاء کا تصور بغیر مکان کے اور حوادث کا تصور بغیر زمانہ کے حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا فلسفۂ اشیاء و حوادث کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے زمان و مکان کی ماہیت کو متعین کرنا ضروری قرار پاتا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے اس سلسلہ میں جو مخصوص نظریہ پیش کیا ہے، پروفیسر رضی الدین صاحب صدیقی نے اس کی وضاحت کی ہے۔ غالباً اس کام کے لیے پروفیسر صاحب سے بہتر کوئی آدمی ہمارے پاس موجود نہیں ہے مگر انھوں نے ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لے کر مضمون کو کچھ تشنہ سا چھوڑ دیا ہے۔ یعنی جو موضوع ایک کتاب چاہتا تھا اسے ایک مقالے میں سمیٹا گیا ہے۔

سیدات اسلام از مولانا شاہ محمد عز الدین صاحب پھلواروی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- مجیبیہ بکڈپو پھلواری شریف، پٹنہ۔

اس کتاب میں امہات المومنین، صحابیات اور صالحات کے مختصر احوال لکھے گئے ہیں۔ اختصار ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ کرامات پیش کرنے میں فراخدلی دکھائی گئی ہے۔ کتاب کی زبان کچھ زیادہ بلند نہیں

اشتراکیت اور اسلام از جناب مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی، بی، اے۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:- اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور۔

یہ رسالہ "ہیگل، مارکس اور نظام اسلام" کے مولف کا لکھا ہوا ہے اور اس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ انسانی فطرت اسلام ہی سے مطمئن ہو سکتی ہے۔ نوجوان مولف کا نام ہی رسالہ کی صحیح حیثیت کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

اقبال کے چند جواہر ریزے از جناب پروفیسر خواجہ عبد الحمید صاحب ایم، اے۔ گورنمنٹ کالج، لاہور۔ قیمت ۱ر۔ ملنے کا پتہ:- اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور۔

یہ ایک مقالہ ہے جس میں مولف نے اقبال کی صحبتوں سے حاصل کیے ہوئے چند نکات و لطائف جمع کیے ہیں۔ ان سے ہمارے نیم فلسفی، نیم صوفی شاعر کی شخصیت پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔

علمائے کرام کا مستقبل از جناب مولوی مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے۔ حیدرآباد، دکن۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ:- اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور۔

علمائے اسلام ہمیشہ سے امت مسلمہ کا دل و دماغ بنے رہے ہیں اور تاریخ اسلام کا سفینہ کھینے والے اصل ناخدا یہی تھے۔ مگر کچھ عرصہ سے اس گروہ میں اجتماعی انحطاط کے اثرات اتنی گہرائی تک جا پہنچے ہیں کہ تہذیبی قیادت کا منصب بظاہر ان سے چھنتا نظر آتا ہے اور اگر خدا نخواستہ یہ واقعہ رونما ہو جائے تو مسلمانوں کی بدنصیبی انتہا کو پہنچ جائے گی۔ اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے اس مقالہ میں صدیقی صاحب نے علمائے اسلام کی روش پر تنقید کی ہے اور انھیں ان کے

فرائض منصبی یاد دلائے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک قابلِ تحسین کوشش ہے۔

انتخابِ غالب از جناب محمد عبدالرزاق، ایچ، سی، ایس۔ مددگار صدر محاسب حکومت آصفیہ۔ قیمت ۲/۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکیڈمی ظفر منزل، تاجپورہ، لاہور۔

مرزا غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں جو انہماک تعلیم یافتہ طبقہ کو ہو رہا ہے، انتخابِ غالب اس کا ایک نمایاں مظہر ہے۔ یہ مرزا کے چند اشعار، خطوط، لطائف وغیرہ کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے جسے خود مرزا نے مرتب کیا تھا۔ اس کا مسودہ دہلی کالج کے پروفیسر جناب ضیاء الدین صاحب ایل، ایل، ڈی کے وسیع کتب خانہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ کم از کم "شیدایانِ غالب" کے لیے یہ بہت ہی قابلِ قدر چیز ہے۔

القراۃ الاعظمیہ از جناب الاستاذ محمد حسن الاعظمی صاحب۔ قیمت ۸/۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ زرافشاں ۵۴، الف سرکلر روڈ، بیرون موچی دروازہ، لاہور۔

عربی تعلیم کے لیے جدید طریقۂ تعلیم کی تلاش کے ساتھ نئی نصابی کتب مرتب کرنے کا کام بھی ہندوستان میں بہت سرگرمی سے ہو رہا ہے۔ اسی سلسلہ میں اعظمی صاحب نے "القراۃ الاعظمیہ" کا پہلا حصہ مرتب کیا ہے۔ اس میں خصوصیت یہ ہے کہ طلبہ کو اعراب سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ البتہ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ شنکراچاریہ، جہابیر، حقیقتِ کرم، وغیرہ موضوعات کو کس بنا پر عربی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اور قرآنی ادب سے اس کا دامن کیوں پاک رکھا گیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب مسلمان بچوں کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہے کیونکہ ہم "عربی زبان برائے عربی زبان" کے بجائے "عربی زبان برائے اسلام" کے قائل ہیں۔

قاعدہ یسرنا القرآن ناشر ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب، بل روڈ، لاہور۔ قیمت درج نہیں۔

مروجہ قاعدہ یسرنا القرآن کا یہ ایک نیا جنم ہے۔ اس میں فنِ تعلیم کے نقطۂ نظر سے تو ترقی کا کوئی قدم اٹھایا نہیں گیا البتہ کتابت، طباعت اور سرورق کے لحاظ سے کچھ زحمتِ تہذیبی صرف کی گئی ہے اور وہ موجودہ حالات میں قابلِ معافی ہے۔

موت و حیات اقبال کے کلام میں مرتبہ جناب ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی۔ ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی۔ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن۔ قیمت ۴/۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل، تاجپورہ۔ لاہور۔

علامہ اقبال مرحوم نے مسلمانوں کو "ترسِ مرگ" کی تباہ کن بیماری سے بچانے کے لیے اپنے کلام میں مرگ و حیات کا جو اسلامی فلسفہ پیش کیا ہے اسے ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے یکجا مرتب کر دیا ہے۔

خانقاہ از جناب ایم اسلم صاحب۔ قیمت مجلد (مع رنگین گرد پوش) دو روپے بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ عبدالحق اکیڈیمی، اشاعت منزل: اُردو گلی، حیدر آباد (دکن)۔

"گناہ کی راتوں" کے معروف مصنف کی نو کہانیوں کا یہ تازہ ترین مجموعہ مروجہ ادبی رجحانات کے دھارے پر

بہتا ہوا ایک سفینہ ہے۔ ہمارے تمام چوٹی کے مصنفین "بازمانہ بساز" کی پالیسی پر چل رہے ہیں، معلوم نہیں "بازمانہ ستیز" پر عقیدہ رکھنے والے اہلِ قلم کا انتظار کب تک کرنا پڑے گا۔

رنگین و سادہ افسانے

از جناب ظفر قریشی صاحب۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ عبدالحق اکیڈمی اشاعت منزل، اردو گلی، حیدرآباد (دکن)۔

۱۴ مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ ترقی پسند ادب کی نگاہ میں چاہے کتنی ہی قدر و قیمت رکھتا ہو مگر انسانیت اس پر سند طمانیت نہیں دے سکتی۔ خصوصاً "کلو پیٹرا کے ساتھ ایک رات" کے متعلق ہم نہیں جان سکے کہ اس کے لکھنے سے نوعِ انسانی کی کونسی خدمت انجام دی گئی ہے۔ اور "دو کسیاں" میں تو قریشی صاحب نے فحش خیالی اور نجاستِ ذوق کی حد کر دی ہے۔ للہ کوئی بتائے کہ اس "پیپ" کو دل و دماغ سے نکال کر آخر ادب کے بازار میں کیوں بیچا جاتا ہے اور خریدار کیسے اس "مواد" کو خریدتے ہیں۔

کنول

از جناب اعظم کریوی صاحب۔ قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ عبدالحق اکیڈمی، اشاعت منزل، اردو گلی، حیدرآباد (دکن)۔

اعظم صاحب بہت معروف افسانہ نویسوں میں سے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعہ ان کے ۱۳ فسانوں پر مشتمل ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے لکھنے والوں کو بھی "ایک لڑکا اور ایک لڑکی" قسم کی کہانیوں کے سوا مظاہرۂ فن کا اور کوئی میدان نہیں ملتا۔ "کنول" کے تمام افسانوں کے پلاٹ غیر متنوع اور پامال سے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض کہانیوں میں "پریم" اور "سماج" کی تکرار ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ مصنف جہاں کہیں اپنی رائے دیتا ہے، بالکل "واعظ" کا سا Direct Method اختیار کرتا ہے حالانکہ افسانہ نویس کا کام یہ ہے کہ وہ مطلوبہ رائے خود قاری کے ذہن سے پیدا کرائے اور اسے یہ محسوس نہ ہونے دے کہ باہر سے اس کے دماغ میں کوئی چیز ٹھونسی جا رہی ہے۔

بچوں کے لیے چند کتابیں

از جناب شجاع احمد صاحب قائد۔ ملنے کا پتہ:۔ عبدالحق اکیڈمی، اشاعت منزل، اردو گلی، حیدرآباد (دکن)۔

نشرگاہ ملکی حیدرآباد دکن نے جناب شجاع احمد صاحب قائد کے جو ڈرامے بچوں کے ذہنی ارتقاء کے لیے وقتاً فوقتاً نشر کیے ہیں، انھیں عبدالحق اکیڈمی نے الگ الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ یہ کتابیں ہماری رائے میں اپنے مقصد کے لیے مفید ہیں۔ فہرست درج ذیل ہے:۔

(۱) جنگ کے بعد کیا ہوگا۔	قیمت ۳/	(۲) لاڈلا اکبر۔	قیمت ۱۰/
(۳) کھٹی میٹھی بتیاں۔	" ۱۰/	(۴) سمندری جہاز۔	" ۴/

(۵) چھتری فوج۔	قیمت	۳ر	(۶) عید۔	قیمت	۸ر
(۷) دسترخوان۔	〃	۳ر	(۸) رابنسن کروسو۔	〃	۱۰ر
(۹) سادہ زندگی۔	〃	۳ر	(۱۰) کپڑے۔	〃	۳ر
(۱۱) چھومنتر کا دھاگا	〃	۴ر	(۱۲) پڑوسی۔	〃	۳ر

کارخانہ از جناب محمد فضل الرحمن صاحب۔ قیمت عمر۔ ملنے کا پتہ:۔ (۱) عبدالحق اکیڈیمی، حیدرآباد دکن۔ (۲) انجمن ترقی اردو (ہند) عابد روڈ، حیدرآباد (دکن)۔

اس مختصر مزاحیہ ڈرامہ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ متوقع معاشی انقلاب سے بچنے کے لیے واحد تدبیر یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ محنت پیشہ طبقہ کے جائز مطالبات کے آگے فراخ دلی سے سرِ تسلیم خم کردے۔ ہمیں خوشی ہے کہ مصنف اپنی تحریر کو غیر معتدل جذباتیت سے محفوظ رکھنے میں ایک حد تک کامیاب رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ کارخانہ میں ایسا فکری عنصر موجود ہے جو ہمارے لیے ناقابلِ تائید ہے۔

چار ڈرامے از جناب ڈاکٹر اشفاق حسین صاحب قریشی۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ، دہلی۔

حسبِ ذیل چار مختصر تمثیلیں فنی اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں، اگرچہ مقصد کے اعتبار سے ان سے کلی اتفاق نہ کیا جاسکے۔

(۱) مٹھائی کی ٹوکری۔	قیمت	۴ر	(۲) بند لفافہ۔	قیمت	۴ر
(۳) کٹھ پتلیاں۔	〃	۸ر	(۴) ملأ اعلیٰ۔	〃	۴ر

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۴۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ضخامت ۵۲۸ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اھمیت حاصل ہے ، محتاج بیان نہیں ۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ھندوستان کے مسلمانوں ، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے ۔ کر رھا ہے ، اور کرتا رہے گا ۔ انشاءاللہ ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔

اس میں جن اھم اور معرکۃالآرا مسائل پر گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ھیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ھیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت ($\frac{20 \times 26}{8}$) ۴۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ ۔ لاھور

سرورق ربن پرنٹنگ پریس ۔ بل روڈ ، لاھور میں چھپا